سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ

جلد (۱)

جس میں ملک مصر روم اور شام کے باشندوں کے عادات واطوار۔ طریق معاشرت۔ طرز تعلیم۔ مقامات قابل سیر۔ خصوصاً ملکی وفوجی حالت اور سلطان المعظم کے عہد کی ترقیات تفصیل سے درج ہیں

مؤلفہ

حافظ عبد الرحمٰن صاحب امرتسری

مؤلف عربی بول چال حصہ اوّل و دوم۔ کتاب الصرف۔ کتاب النحو۔ الصدیق۔ المرتضےٰ اور ترقیات عرب

سنہ ۱۹۰۵ء

مفید عام لاہور میں بذریعہ سٹیم پریس طبع ہوا

اوّل ۱۰۰۰ جلد قیمت فی جلد دیسی کاغذ عہ

فہرست سفرنامہ بلاد اسلامیہ

دوسرا حصہ روم کے حالات

تیسرا حصہ شام کے حالات

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

تھوڑا عرصہ ہوا کہ میں نے مصر استنبول اور شام کا سفر کیا اور دو برس تک ان ملکوں میں رہکر عربی زبان۔ اور وہاں کے باشندوں کے عادات واطوار۔ طریق معاشرت۔ اور طرز تعلیم سے آگاہی حاصل کی۔ آثار قدیمہ اور مقامات قابل سیر خوب پھر کر دیکھے۔ خصوصاً ملک کی انتظامی حالت اور جنگی طاقت کے متعلق واقفیت بہم پہنچائی۔ سلطان المعظم کے عہد کی ترقیات پر اہل الرائے اصحاب سے گفتگوئیں ہوئیں۔ ان حالات کی جوں جوں واقفیت ہوتی گئی اخبار وکیل امرتسر اور مشیر آصفی مدراس کے ذریعہ اپنے ہموطنوں کی آگاہی کے لئے مشتہر کرتا رہا۔ دیگر اخبار نویسوں نے بھی وقتاً فوقتاً انکا اقتباس اپنے پرچوں میں درج کیا +

نہایت خوشی کا مقام ہے کہ مسلمانان ہندوستان نے بلاد اسلامی کے حالات بہت دلچسپی سے پڑھے۔ چنانچہ یہ انہیں تحریروں کا اثر تھا کہ واپسی کے وقت مجھے ہندوستان کے جس جس شہر سے گذرنے کا اتفاق ہوا وہاں کے مسلمانوں نے بلاد اسلامی کا سفرنامہ شایع کرنے پر توجہ دلائی۔ خصوصاً وہاں کے ملکی وجنگی حالات اور سلطان المعظم کی موجودہ ترقیات کے اندراج کو بہت اہم قرار دیا۔ فی الحقیقت یہ ایسے امور ہیں جن پر کسی ہندوستانی سیاح

نے آج تک قلم نہیں اٹھایا۔ اس وقت ممالک غیر کے جتنے سفرنامے ہندوستان میں موجود ہیں اُن کا دائرہ عموماً تعلیمی اور تمدنی حالات تک محدود ہے۔ اس لئے مینے اپنے ملکی بھائیوں کی یہ درخواست بخوشی قبول کر کے سفر کے مسلسل حالات لکھنے شروع کر دیئے ✣

یہ چند اوراق جو سفرنامہ کی شکل میں ہدیۂ ناظرین کئے جاتے ہیں ان کا میٹیریل کچھ تو وہی مضامین ہیں جو راقم کی طرف سے اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ اور کچھ قلمی یادداشتیں ہیں جو میرے پاس اب تک محفوظ تھیں آثار اسلام اور عمارات قدیمہ کی تصاویر و عکس بھی میرے پاس تھے۔ مگر ان کے عمدہ چھپنے کا انتظام ہندوستان میں نہیں ہو سکا۔ اگر ملک نے اس ناچیز تحریر کی قدر کی تو دوسرا اڈیشن تصاویر اور نقشہ جات کے ساتھ چھاپا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالے۔ فقط ✣

خاتمہ پر مینے اپنی ذاتی سرگزشت مختصر طور پر لکھی ہے جس سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ ایک مسافر تھوڑے روپیہ سے اتنا لمبا سفر عزت اور آرام کے ساتھ کس طرح کر سکتا ہے ✣

(دستخط) حافظ عبدالرحمن امرتسری

لاہور
یکم دسمبر ۱۹۰۴ء

سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سفر کی روانگی اور جلسۂ ندوۃ العلما

۸۔ مارچ ۱۸۹۶ء کو میں بارادۂ سفرِ بلادِ اسلامیہ گھر سے نکلا۔ اس زمانہ میں انجمن ندوۃ العلما کا پانچواں اجلاس کانپور میں ہو رہا تھا۔ چونکہ میرے سفر کا ایک خاص مقصد یہ بھی تھا کہ بلادِ اسلامیہ میں جاکر مسلمانوں کی ترقیوں سے مستفید ہوں۔ اس واسطے میرے دل نے بے اختیار چاہا کہ اس جدید اسلامی انجمن کی عظمت کی تصویر بھی دیکھتا چلوں جو ہندوستان میں چند سال سے قائم ہوئی ہے۔ اور مختلف الخیال علما کو اتحاد کی سٹیج پر لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میرے اس ارادہ کو میرے مکرم دوست حافظ عبد الحق صاحب سوداگر اور مولوی نور الدین صاحب تاجر کتب مصریہ مقیم کانپور کے بے حد اصرار نے اور زیادہ مستحکم کر دیا۔ چنانچہ میں نے اس اسلامی مجلس میں شامل ہونے کی غرض سے کانپور کا رُخ کیا۔

جب میں کانپور کے اسٹیشن پر پہونچا تو یہ دونوں بزرگ ازراہِ کرم اپنے احباب سمیت میرے لینے کے لئے موجود تھے۔ سب صاحب بڑے

تپاک سے ملے اور یہ قرار پایا کہ مَیں اپنے مکرم دوست مولوی نورالدین صاحب کے مکان پر اُتروں۔ چنانچہ خاکسار اس فیصلہ کے بعد مع مولوی صاحب ایک گاڑی میں سوار ہوکر اُن کے مکان کو روانہ ہوا۔ مولوی صاحب نے راقم کے زمانۂ قیام میں ایسی تواضع و مہماں نوازی کو کام فرمایا جو اسلامی اخوت کا ایک عمدہ نمونہ تھی۔

ندوۃ العلما کے اجلاس کی کارروائی تو قریباً ختم ہوچکی تھی مگر علمائے کرام اور رؤسائے عظام جو دُور دراز مقامات سے آئے ہوئے تھے اُنکی بے تکلف ملاقاتوں اور آزادانہ گفتگو سے اسلامی شان کا ایک ایسا نقشہ وہاں نظر آیا جو فی الواقع نہایت دل خوش کن اور آیندہ اسلامی بہبود کی امید دلانے والا تھا۔ مہمانانِ انجمن کی روانگی کے بعد دو روز تک میرا قیام حافظ عبدالحق صاحب کے ہاں رہا۔ حافظ صاحب بہت با اخلاق اور مسافر نواز ہیں۔ مجھے اس موقعہ پر انکی تجارتی معلومات سے جو ایک خاندانی تاجر ہونے کی حیثیت سے اُنہیں حاصل ہیں فائدہ اُٹھانے کا اچھا موقعہ ملا۔ جس نے مصر و استنبول وغیرہ کے سفر میں بہت فائدہ پہونچایا۔

بمبئی اور انجمن تبلیغ الاسلام | میں کانپور سے آگرہ اور بھوپال ہوتا ہوا ۱۹ء کو بمبئی پہونچا۔ اور حکیم شیخ غلام محی الدین صاحب مالک و ایڈیٹر اخبار انڈیا گزٹ و سیکرٹری انجمن تبلیغ الاسلام کے ہاں ٹھہرا۔ حکیم صاحب میرے ہم وطن اور قدیم عنایت فرما ہیں۔ سفرِ مصر کے متعلق اُن سے پہلے خط و کتابت ہوچکی تھی۔ حکیم صاحب اس وقت جس انجمن کے سیکرٹری ہیں وہ دسمبر ۱۸۹۲ء میں حاجی

ریاض الدین احمد صاحب بریلوی و حکیم صاحب موصوف کی تحریک سے قائم ہوئی تھی۔ سیٹھ رحیم بھائی محمد رائسی نے جو بمبئی میں خوجہ قوم کے ایک معزز رکن اور بڑے پایہ کے سوداگر سمجھے جاتے ہیں اس کا سرپرست ہونا قبول کیا۔ اور دوڈھائی سو روپیہ ماہوار کے مصارف نہایت دریا دلی سے اپنے ذمہ لئے یہاں کے دیگر اُلوالعزم اور دیندار مسلمان بھی اس کار خیر میں اسی قدر چندہ ماہوار کے دینے سے اُن کے معین اور شریک ہوئے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً اسلام کی حقانیت پر لیکچر دئے جائیں۔ اور تحریروں و تقریروں کے ذریعہ سے غیر مذہب والوں پر اس دین مبین کی خوبیاں ظاہر کر کے اشاعت اسلام میں کوشش کی جائے۔ نومسلموں کو چند روز تک ضروری امداد دیجائے تاکہ وہ اس عرصہ میں اسلامی احکام سے بقدر ضرورت واقف ہوں اور اپنی معاش کا ذریعہ پیدا کریں۔ شائقین کے فائدہ کی غرض سے عربی۔ انگریزی۔ فارسی اردو اور گجراتی اخبار بھی بہم پہونچائے جائیں۔

اس انجمن کو چلانے کے لئے سب سے پہلے مسٹر حامد سنو ایک امریکن نومسلم جن کے زورِ قلم کا اُن دنوں عام شہرہ تھا سکندرآباد دکن سے بُلا کر منتظم مقرر کئے گئے۔ اور بدر الدین عبداللہ کور صاحب جو شہر کے اراکین اور علم دوست اصحاب میں سے ہیں صدر انجمن قرار پائے۔ سیٹھ رحیم بھائی کی امدادی رقم مسٹر حامد سنو کے مصارف اور کرایہ مکان کے واسطے مختص کر دیگئی۔ چندہ کی دیگر رقوم نومسلموں کی امداد میں صرف ہونے لگیں۔ مسٹر حامد کسی قدر تیز مزاج تھے۔ اس لئے چار یا پنج ماہ سے زیادہ نہ ٹکے۔ ان کے بعد ملا مرزا خان صاحب

پشاوری جو ایک پُر جوش عالم اور بڑے دیندار ہیں اس انسٹیٹیوشن کے کارکُن اور منتظم مقرر ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ صاحب بھی سوا برس بعد آسٹریلیا تشریف لے گئے۔ اور انجمن کی بدقسمتی سے سیٹھ رحیم بھائی نے اپنے کسی مذہبی خیال کی بنا پر چندہ سے دست کشی کی۔ انجمن کے مدخل میں بڑی کمی واقع ہوئی۔ تب چند دیندار مسلمانوں نے اس کار خیر کی عنان اپنے ہاتھ میں لی۔ اور حکیم غلام محی الدین صاحب جو انجمن محافظ حجاج بمبئی کے سیکرٹری تھے اس کے سیکرٹری اور منتظم قرار پائے۔ اس وقت یہ انجمن حکیم صاحب کے حسن انتظام سے خاصی حالت میں ہے۔ مگر چندہ دینے والوں اور مددگاروں کی جو گرم جوشی اور توجہ پہلے تھی وہ اب نہیں رہی۔ اور چندہ کی مقدار اس قدر گھٹ گئی ہے کہ جہاں سیکڑوں روپے ماہوار چندہ آتا تھا اب دہائیوں کی نوبت پہونچ گئی ہے۔ حکیم صاحب کا ارادہ ہے کہ بمبئی کے اطراف و جوانب میں دورہ کر کے انجمن کے واسطے روپیہ فراہم کریں۔ مگر حکیم صاحب کے ذاتی مشاغل سردست اس تجویز کے مانع ہیں۔

بمبئی کے حالات اور سفر جہاز کے متعلق چند ضروری معلومات

رونق اور آرایش کے لحاظ سے بمبئی ہندوستان میں ایک اعلیٰ درجے کا شہر خیال کیا جاتا ہے۔ تجارت کی بدولت یہاں کے لوگوں میں تموّل بڑھا ہوا ہے اور گو شدّت طاعون سے باہر کے لوگوں کا یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ بمبئی میں ویرانی اور تباہی کے آثار پائے جاتے ہوں گے اور فی الحقیقت یہ خیال قرین قیاس بھی تھا لیکن نووارد شخص کو یہاں کی چہل پہل، کاروبار دُنیوی میں لوگوں کی مشغولیت اور بازاروں میں آمد و رفت کی کثرت دیکھکر اس غدّار شہر میں یک بیک اس تباہی کا پتہ چلنا

مشکل ہو جاتا تھا۔

سوءِ اتفاق سے مجھے بھی اُنہی دِنوں بخار نے آ دبایا۔ اور تین ہفتے تک پیچھا نہ چھوڑا۔ میرے مکرم دوست حکیم منشی بدرالدین صاحب نے جو بڑے تجربہ کار طبیب اور میرے پُرانے معالج ہیں میری شدّت مرض کا حال دریافت کر کے امرت سر واپس آنے پر زور دیا۔ مگر میرا عزم بالجزم واپسی کا مانع ہوا۔ اور جب خداوند کریم کے فضل سے بیماری کا زور گھٹ گیا اور افاقہ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ تو میں نے سفر مصر کی تیاری شروع کی۔

بمبئی کے ایام اقامت میں بدرالدین عبداللہ قور صاحب کے ہاں میری آمد و رفت بہت بڑھ گئی تھی۔ آپ مجھے اکثر اوقات گاڑی پر اپنے ہمراہ ہوا خوری اور سیر کو لیجاتے رہے جس سے میری صحت میں بہت کچھ ترقی ہوئی۔ ان کے علاوہ سردار بہادر میر عبدالعلی صاحب سپرنٹنڈنٹ خفیہ پولیس بمبئی نے بھی مسافر نوازی کا حق بڑی خوبی سے ادا کیا۔ مَیں اِن دونوں صاحبوں کا ممنون ہوں۔

وطن چھوڑنے سے قبل یہ امر میری نظر میں بہت اہم تھا کہ جہاز کا کرایہ۔ اوقات روانگی۔ انتظام خورد و نوش وغیرہ ضروری مراتب کا حال دریافت ہو جائے تاکہ بمبئی پہونچنے پر مجھے کسی قسم کی دِقت نہ ہو۔ چنانچہ اسی غرض سے میں نے اپنے بمبئی کے دوستوں کو خطوط لکھے اور جو جو امور ضروری دریافت طلب تھے اُن کی نسبت پوری پوری واقفیت بہم پہونچانی چاہی۔ ان خطوں کے ذریعہ سے مجھے معلوم ہوا کہ میل اسٹیمر (ڈاک کا جہاز) کے علاوہ دو تین جہاز ہر ہفتہ یورپ جاتے ہیں اور ٹکٹ ہر وقت بلا دقت مل سکتا ہے۔ اسلئے ٹکٹ کی طرف سے مجھے بےفکری تھی لیکن بمبئی پہونچنے

پر معلوم ہوا کہ جہاز تو واقعی بہت سے جاتے ہیں لیکن میل اسٹیمر کے سوا جو ہر ہفتہ ولایتی ڈاک اور فرنگستانی مسافروں کو لے کر جاتا ہے اَور کسی جہاز کی روانگی کا وقت معین نہیں بلکہ روانگی کی تاریخیں وقتاً فوقتاً مقرر ہوتی رہتی ہیں یہ جہاز علی العموم بیوپاریوں کا مال لے کر جاتے ہیں اور حسب گنجایش مسافروں کو بھی بٹھا لیتے ہیں۔ پھر ان جہازوں کا حال بھی مختلف ہے۔ بعض کا کرایہ زیادہ اور بعض کا تھوڑا ہوتا ہے۔ بعض جہاز چھوٹی بڑی تمام بندرگاہوں پر ٹھہرتے ہیں اور آہستہ آہستہ سفر کرتے ہیں۔ بعض صرف بڑی بڑی بندرگاہوں پر لنگرانداز ہوتے ہیں اور بہت جلد منزلِ مقصود پر پہونچ جاتے ہیں۔

بمبئی سے وقتاً فوقتاً مختلف مقامات مثلاً بوشہر۔ سویز۔ کیپ ٹاون سیلون (لنکا) ممالک شرقی مثل چین جاپان وغیرہ کو جہاز روانہ ہوتے رہتے ہیں۔ جب کوئی جہاز اپنا سفر طے کرنے کے بعد بمبئی واپس آنے کو ہوتا ہے تو اس کی اطلاع چند روز پہلے اسکے ایجنٹ مقیم بمبئی کے نام آجاتی ہے کہ فلاں جہاز فلاں تاریخ بمبئی پہونچے گا۔ اور اتنے دنوں کے بعد فلاں سمت کو روانہ ہوگا۔ اِن ایجنٹوں کے علحدہ علحدہ دفاتر بمبئی میں موجود ہیں۔ اور ہر دفتر سے جہازوں کے آنے جانے کی خبریں بمبئی و گرد و نواح میں انگریزی اخبارات کے ذریعہ سے مشتہر ہوتی رہتی ہیں۔ اس طرح ہندوستان کے انگریزی خوانوں کو روانگی جہازات کی مجمل اطلاع ہوجاتی ہے۔ مگر یہ امور کہ اس جہاز میں کتنے مسافروں کی گنجایش ہوگی۔ ہر درجہ کا کیا کرایہ ہوگا۔ اور یہ جہاز تیز سفر کرنے والا ہے یا آہستہ۔ ایجنٹ متعینہ بمبئی سے خط و کتابت کئے بغیر معلوم نہیں ہوسکتے۔ پس جو صاحب بحری سفر کا ارادہ رکھتے ہوں اُن کو چاہیے کہ وطن

چھوڑنے سے پہلے بذریعہ خط وکتابت ٹکٹ کا بندوبست کرلیں۔ جہازوں کے ایجنٹ اس جگہ بہت سے ہیں لیکن ٹامس کُک کی ایک مشہور کمپنی ہے اس سے خط وکتابت کرنے میں بہت کچھ سہولت ہوجاتی ہے۔ ایک ہندوستانی دلّال بھی بھنڈی بازار میں رہتا ہے جس کا نام آتش خان ہے۔ ایجنٹ مذکور کارکنان جہاز سے کمیشن پر ٹکٹ فروخت کرتے رہتے ہیں۔

جہاز کے درجے اور کرایہ ہر جہاز میں عموماً تین درجے کا ٹکٹ ملتا ہے اول۔ دوم۔ سوم۔ تیسرے درجے کو عام طور پر ڈیک کہتے ہیں جسکے معنے سطح جہاز کے ہیں اور تیسرے درجہ کے مسافروں کی آرام گاہ یہی سطح ہوتی ہے۔ پہلے اور دوسرے درجہ میں کرایہ کے ساتھ قیمت خوراک بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ مگر تیسرے درجے کے مسافر اپنی خوراک کا خود بندوبست کرتے ہیں۔ ہندوستانی مسافروں کے لئے یہ امر فائدہ سے خالی نہ ہوگا کہ رفتار جہاز کی تیزی وآہستگی۔ آرام وآسائش کی کمی زیادتی۔ اور مصارف کی قلت وکثرت کے لحاظ سے اُن کی اقسام دریافت کی جائیں

میری معلومات کے مطابق سفری جہاز زیادہ تر تین قسم کے ہوتے ہیں۔

(۱) ڈاک کا جہاز۔ یہ جہاز ہر ہفتہ ولایتی ڈاک لے کر بمبئی سے روانہ ہوتا ہے اور پی اینڈ او (پیننشولا اینڈ اورئینٹل) کمپنی کا جہاز کہلاتا ہے۔ عام لوگ اِسے پینو کمپنی کا جہاز کہتے ہیں۔ اس میں عموماً اول اور دوم درجے کے مسافر سوار ہوتے ہیں تیسرے درجے کا ٹکٹ مسافران مذکورہ بالا کے خدمتگاروں کے سوا اور کسی کو ذرا مشکل سے ملتا ہے۔ مسافران درجہ اول ودوم کے لئے ہر طرح کی راحت وآسائش کا پورا بندوبست کیا جاتا ہے مگر تیسرے درجہ والوں کے آرام کی کچھ پروا نہیں کیجاتی

جتنے فوجی و ملکی انگریز عہدہ دار ولایت جاتے ہیں یا ہندوستانی امرا و مستطیع اصحاب سیر و سیاحت کی غرض سے یورپ جانا چاہتے ہیں۔ یا دیسی طلبا، سول سروس۔ بیرسٹری۔ انجنیری وغیرہ کی تعلیم پانے کے لئے فرنگستان کے عازم ہوتے ہیں وہ سب اسی جہاز پر سفر کرتے ہیں۔ یہ جہاز سب قسم کے جہازوں سے زیادہ تیز رفتار ہے۔

(۲) تجارتی جہاز۔ اس میں تجارتی مال اور مسافروں کے علاوہ ممالک یورپ کی ڈاک بھی ہوتی ہے۔ اس کی روانگی کی تاریخیں وقتاً فوقتاً مشتہر ہوتی رہتی ہیں۔ مسافران درجہ اول و دوم کے علاوہ تیسرے درجہ کے مسافروں کو بھی اسمیں علی العموم ٹکٹ ملجاتا ہے۔ اور بمقابلہ ہینیو کمپنی کے تیسرے درجہ کے مسافروں کو اسمیں زیادہ آرام رہتا ہے۔ چنانچہ جس جہاز میں میں نے سفر کیا اُس میں ہندوستانیوں کے علاوہ پندرہ بیس اٹیلین۔ یونانی اور ارمنی بھی تیسرے درجے کے مسافروں میں تھے جو ممالک مشرقی کے سفر سے واپس آرہے تھے۔ رفتار کے لحاظ سے اگر ہینیو کمپنی کے جہاز کو ڈاک گاڑی سے تشبیہ دیجائے تو یہ جہاز مسافر گاڑی کا حکم رکھتا ہے۔ البتہ مختلف بندروں پر مال اُتارنے اور چڑہانے کے لئے ٹھیرتا ہوا جاتا ہے۔ اس جہاز کا کرایہ ہینیو کمپنی کے جہاز سے کچھ کم ہوتا ہے۔ چنانچہ بمبئی سے سویز تک ہر درجہ کی تفصیل یہ ہے

مسافر درجہ اول کے واسطے	۳۶۰ (۳۶۰ روپے)
مسافر درجہ دوم کے واسطے	۲۲۰ (۲۲۰ روپے)
مسافر درجہ سوم کے واسطے	۵۰ (۵۰ روپے)

(۳) باربرداری جہاز - ان جہازوں میں صرف مال لادا جاتا ہے۔ کپتان جہاز کو اختیار ہے کہ حسب موقعہ دو چار مسافروں کو بھی بٹھالے - اور مشہور ہے کہ ان مسافروں کا کرایہ کپتان ہی کی نذر ہوتا ہے - ان جہازوں کی روانگی کا کچھ ٹھیک نہیں۔ جب مال مہیا ہوتا ہے چھوڑ دئے جاتے ہیں اور بہت دیر میں مسافت طے کرتے ہیں - ان جہازوں کی رفتار مال گاڑی کی مانند ہوتی ہے اور اکثر ایسے مسافران میں سوار ہوتے ہیں جنکے پاس خرچ کم اور جن کو وقت کی قیمت کا چنداں خیال نہ ہو۔

مسافران درجہ اول و دوم کی نشست کے واسطے عمدہ قسم کی کرسیاں اور لکھنے پڑھنے کے واسطے میزیں جہاز کی سطح پر اور سونے کے واسطے نیچے کی چھت پر علیحدہ علیحدہ خوابگاہیں موجود ہوتی ہیں جہاں وہ دھوپ اور بارش کی تکلیف سے محفوظ رہتے ہیں۔ مگر درجہ سوم کے مسافروں کے سونے بیٹھنے کے لئے جہاز کی ہموار چھت کے سوا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ اسواسطے ہر شخص کو کم از کم ایک آرام کرسی اور ایک ہلکا سفری پلنگ خود ساتھ رکھنا چاہئے تاکہ چھت کے تختے پر نہ سونا پڑے جو بے آرامی کے علاوہ صحت جسمانی کے لئے بھی بڑا مضر ہے۔

جہاز میں کھانے کا انتظام پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کو کھانے کا انتظام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کے کرایہ ہی میں کھانے کی قیمت شامل ہوتی ہے۔ ہاں تیسرے درجے والوں کو کھانے کا انتظام خود کرنا پڑتا ہے اور اس درجے کے مسافر بالعموم روانگی سے پیشتر کھانے کی چیزیں - از قسم چاول - گھی - اچار - چٹنی - نمک - مرچ - لیموں - بسکٹ - ڈبل روٹی - چائے - چینی - دال - آلو - پیاز - سرکہ - فصل کی پھل پھلاری - سبزی - ترکاری خرید کر ساتھ رکھ لیتے ہیں۔

ایک لوٹا۔ دو دیگچیاں۔ ایک سماوار۔ دو تین پیالیاں۔ ایک گلاس۔ ایک رکابی اور ایک پیالہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ بعض مستعد اور باخبر اشخاص پانچ سات مرغیاں بھی کھانچے میں رکھ لیتے ہیں۔ تاکہ وقتاً فوقتاً گوشت کھانے کا موقع ملتا رہے۔ جہاز میں ان چیزوں کے رکھنے کی کچھ ممانعت نہیں۔ کیونکہ سب قسم کا سامان دو من پختہ تک ساتھ لیجانے کی اجازت ہے۔ یوں تو اکثر اشیاء خوردنی جہاز پر بھی ملجاتی ہیں مگر دام زیادہ دینے پڑتے ہیں۔ اس لئے جہانتک ممکن ہو ضرورت کے موافق سامان ساتھ ہی لے لینا چاہیئے۔

جو لوگ کھانا پکانا جانتے ہیں اُن کے لئے جہاز گھر کی طرح ہے۔ سامان ہر قسم کا موجود ہوتا ہے جو چاہا پکالیا۔ مگر جو شخص خود پکانے سے معذور ہیں اور کوئی نوکر یا رفیق بھی اُن کے ہمراہ نہ ہو تو انہیں بیشک دقت پڑتی ہے۔ اور وہ اس پر مجبور ہوتے ہیں کہ جہاز کے باورچی سے کچھ ٹھہراکر اُسے دونوں وقت کا کھانا پکانے کا سامان دیدیں اور جیسا کچھ وہ پکائے صبر شکر سے کھالیں۔ اور اگر ان جھگڑوں سے نجات چاہتے ہوں تو جہاز والوں سے کھانے کا بندوبست کرلیں۔ اور ٹکٹ لیتے وقت کھانے کی قیمت بھی دیدیں جو ایک روپیہ یومیہ کے قریب ہوتی ہے۔ اس صورت میں ملازمان جہاز اوقات مقررہ پر مسافر کی فرودگاہ پر کھانا پہونچا دیتے ہیں۔ جسمیں صبح کی چائے بھی ہوتی ہے۔

پاسپورٹ جہازوں کے اوقات روانگی۔ شرح کرایہ۔ اور خورد ونوش کے حالات دریافت کرلینے کے بعد سب سے اہم معاملہ پاسپورٹ کا معلوم ہوا۔ پاسپورٹ ایک طرح کا پروانہ راہداری اور اپنی گورنمنٹ کی رعایا ہونے کی سند ہے۔ قانون بین

الاقوام کے مطابق یہ امر قرار پا چکا ہے کہ غیر ملکوں میں سفر کرنے والوں کے لئے اپنی گورنمنٹ سے پاسپورٹ کا حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ اسمیں کئی ملکی مصلحتیں ملحوظ رکھی گئی ہیں اور مسافروں کو بھی اس سے بڑا آرام ملتا ہے۔ گورنمنٹ ہند کے احکام کے مطابق ہر شخص مقامی افسر کو درخواست دے کر اُس سے پاسپورٹ کے متعلق ایک تحریر لے سکتا ہے جو جہاز پر سوار ہونے سے پہلے بندرگاہوں مثل کراچی بمبئی۔ مدراس وغیرہ میں خاص عہدہ داران کے روبرو پیش کی جاتی ہے۔ اور وہ مقررہ فیس لے کر پاسپورٹ دے دیتے ہیں جس شخص کے پاس یہ پاسپورٹ نہ ہو اُسے ممالک غیر کے بندرگاہوں پر اُترنے میں کبھی کبھی سخت دقتیں پیش آتی ہیں۔

سوءِ اتفاق سے مجھے روانگی کے وقت پاسپورٹ لینے کا خیال نہیں آیا بمبئی پہونچکر اس معاملہ میں جو کوشش کی گئی اگرچہ اُسکے ضروری مراحل طے کرنے میں سردار بہادر میر عبدالعلی صاحب سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بڑی اعانت کی مگر ابتداءً میری ناسازئی طبیعت اور پھر چلنے کی جلدی اور وقت کی قلت نے تحقیقات کے جملہ مدارج طے نہ ہونے دئے۔ ناچار پاسپورٹ کا معاملہ زیر تجویز چھوڑ کر مجھے جہاز پر سوار ہونا پڑا۔ مگر ایسی غلطیوں کا جو ناگوار اثر ہوتا ہے میں اُس سے بچ نہ سکا۔ جیسا کہ سویز کے حالات میں لکھا جائے گا۔

بمبئی سے ٹکٹ لیکر جہاز پر سوار ہونا۔

مندرجہ بالا حالات سے کما حقہٗ آگاہی نہونے کے باعث مجھے اور میرے دوستوں کو بہت دقتیں پیش آئیں۔ اور چونکہ بمبئی میں جہازی ایجنٹوں کے بہت سے دفاتر ہیں اسلئے

ٹکٹ لینے میں بھی کچھ کم وقت صرف نہیں ہوا۔ مجموعی طور پر اپنی بیماری اور ضروری امور کی تحقیقات و انصرام کے سبب مجھے سوا مہینے سے زیادہ بمبئی میں ٹھہرنا پڑا۔ میں اس موقعہ پر حکیم شیخ غلام محی الدین صاحب سکرٹری انجمن تبلیغ الاسلام کا بے حد ممنون ہوں جنکی مہربانی سے یہ مشکلات بہت کچھ سہل ہوگئیں۔ آخرکار مجھے ایک اٹیلین جہاز میں جسکا نام "روفیلا ربٹن جنوا" تھا ٹکٹ ملگیا۔ اور جس قدر روپیہ میرے پاس تھا اُسکے عوض میں طلائی سوَرین لے لئے (جن کو انگریزی اشرفی کہتے ہیں) کیونکہ جہازوں اور نیز ممالک غیر میں ہندوستانی روپے پیسے کا چلن نہیں۔ سوَرین کی قیمت ہندوستانی سکہ میں پندرہ روپے اور اُسکا خوردہ بیس شلنگ میں ہوتا ہے۔ اور ہر شلنگ کی قیمت بارہ آنے کے مساوی سمجھی جاتی ہے۔

۲۹ اپریل کو بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا کہکر میں جہاز پر سوار ہوا۔ حکیم صاحب جو اپنے دوستوں کے ہمراہ مجھے رخصت کرنے آئے تھے۔ چشم پُرنم کے ساتھ خیرباد کہکر رخصت ہوئے۔ اور میں نے بھی کچھ عرصہ کے لئے وطن و اہل وطن کو بھاری دل سے وداع کیا۔ لنگر اُٹھانے سے قبل ایک یورپین ڈاکٹر جہاز پر آیا جس نے تمام مسافروں اور خلاصیوں کا معمولی معاینہ کرکے روانگی کی اجازت دی۔ روانگی کے وقت عجیب نظارہ تھا۔ بمبئی کا شہر اپنی عالیشان اور خوبصورت عمارتوں اور مرتفع و خوشنما گھاٹوں سمیت آنکھوں کے سامنے ایک دلکش و نظر فریب سماں دکھاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کشتیاں گودی (جہاز کے ٹھہرنے کا پختہ حوض) میں آگے پیچھے آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں۔ چند جہاز بھی اِدھر اُدھر لنگر ڈالے کھڑے تھے۔

جو اپنے اونچے اونچے مستولوں پر سے مختلف الالوان پھریرے ہوا میں اُڑا کر گویا اپنے ہم جنس کو رخصت کرتے ہوئے رومال ہلا رہے تھے۔ جوں جوں ہمارا جہاز آگے بڑھا ووں ووں یہ نظارہ آنکھوں سے دور ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ خشکی نگاہ سے اوجھل ہوگئی۔ اب نیچے پانی اور اوپر آسمان کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سمندر کا پانی ساحل کے قریب تو سبزی مائل تھا مگر آگے بڑھنے سے نیلاہٹ ترقی کرتی گئی اور کچھ دور جا کر آسمان و زمین ہمرنگ اور کناروں سے ملے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

جہاز کی حرکات سے عموماً سر چکراتا اور جی متلاتا ہے۔ کبھی کبھی قے بھی ہو جاتی ہے۔ مگر مجھے صرف ایک دفعہ استفراغ ہوا۔ پھر دو ایک روز متواتر لیٹے رہنے سے طبیعت درست ہو گئی۔ کمزور معدہ والوں کو اس حرکت کا اثر زیادہ ناگوار طریقہ پر محسوس ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی دوران سر بہت بڑھ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ادویہ قاطع صفرا اور کلوروڈین فائدہ مند ثابت ہوئی ہیں۔

حرکات جہاز کی شکایتوں سے جب کچھ افاقہ ہوا۔ اور بحری سفر سے طبیعت قدرے مانوس ہوگئی۔ اور جی کا متلانا اور سر کا چکرانا جاتا رہا۔ تو دن اچھے گذرنے لگے۔ اکثر سارا سارا دن قدرتی نظاروں کے دیکھنے اور ایک ایرانی سیاح سے مختلف معاملات پر گفتگو کرنے میں بسر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی کتاب لے بیٹھتا اور اپنا جی بہلاتا۔ اور کبھی قلم دوات لے کر حالات سفر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

عدن ہمارا جہاز چھ دن کے عرصہ میں عدن پہونچا۔ جو بمبئی سے ۱۶۶۴ میل ہے۔ مگر وہاں سامان اُتارنے اور کوئلہ لینے کے لئے صرف آٹھ گھنٹے ٹھہرنے کی اجازت تھی

قرنطینہ کی بندش کے باعث نہ ہم میں سے کسی کو شہر جانے کا موقعہ ملا نہ شہر والوں میں سے کوئی جہاز کے اندر آسکا۔ البتہ جب تک جہاز اس بندر میں ٹھہرا رہا۔ عجب چہل پہل رہی۔ یہودی سوداگر کشتیوں میں بیٹھکر مختلف اقسام کی چیزیں فروخت کرنے آتے تھے۔ اور اپنی کشتیاں جہاز سے بھڑا کر ٹھہرا لیتے تھے۔ اور ایک ایک چیز اُٹھا کر دور سے مسافروں کو دکھاتے تھے۔ جب کوئی چیز کسی کو پسند آتی اور دام ٹھہر جاتے تو رسّی میں باندھکر وہ چیز کھینچ لی جاتی اور اسکے دام اسی طرح یہودیوں کو پہونچا دئے جاتے۔

عدن کے متعلق جو بات نہایت دلچسپ اور دور دور مشہور ہے وہ سمالی قوم کے کالے کالے لڑکوں کے کرتب ہیں جو چھوٹی چھوٹی کشتیوں اور ڈونگیوں میں سوار ہوکر ہاتھوں میں لمبے لمبے بانس لئے ہوئے جہاز کے کنارے پر آتے ہیں اور ڈونگیوں کو چھوڑ کر بے تکلف سمندر میں کود پڑتے ہیں۔ اور بڑی دیر تک مینڈک کی طرح بے تکان اور بے خوف ہوکر پانی میں اُچھلتے کودتے رہتے ہیں اور مسافروں سے انعام مانگتے ہیں۔ جب کوئی چیز مثل دوتی چوتی کے پانی میں پھینکی جاتی ہے تو نہایت تیزی سے غوطہ لگاتے ہیں اور سمندر کی تہ سے اُسے نکال لاتے ہیں۔ اور دانتوں میں رکھکر مسافروں کو دکھا دیتے ہیں۔ گویا زبانِ حال سے یہ کہتے ہیں کہ دیکھو ہم نکال لائے ہیں۔ اُنکی یہ کارگذاری نہایت تعجب و حیرت سے دیکھی جاتی ہے اور جہاز کے لوگ گھنٹوں اُن لڑکوں کو ٹھہرائے رکھتے ہیں اصل یہ ہے کہ وہ بڑے تیراک ہوتے ہیں اور مچھوے کی مانند پانی میں بڑی تیزی سے گھس جاتے ہیں۔ جو دوتی چوتی پھینکی جاتی ہے وہ ہلکی اور چھوٹے ہونیکے

باعث سطح سمندر سے آہستہ آہستہ نیچے جاتی ہے اور یہ اپنی تیزی کے سبب اُسے راستہ میں جا لیتے ہیں۔ بلکہ اکثر اوقات گز دو گز سے نیچے نہیں جانے دیتے۔ اور چیل سے بھی زیادہ تیزی سے جھپٹا مار کر لے آتے ہیں۔

عدن سے جہاز روانہ ہو کر ۹ مئی کو سویز میں پہونچا۔ ہمارا یہ سفر ۱۳۱۰ میل کا تھا جو غالباً چار دن کے عرصہ میں طے ہوا۔ ان دونوں بندرگاہوں کے درمیان متعدد مقامات پر روشنی کے مینار دکھائی دئے جنکو لائٹ ہوس کہتے ہیں یہ مینار خطرناک مقامات پر جہاز کی رہنمائی کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ان پر ہمیشہ آدمی متعین رہتے ہیں۔ اور شب کے وقت لالٹینوں کو روشن رکھتے ہیں۔ اگر کسی روز کہر کی شدت سے دن کو تاریکی بڑھ جائے تو اُس وقت بھی روشن کر دیتے ہیں۔ ان میناروں کی روشنی بڑی دور تک پڑتی ہے اور رات کو دور سے بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ایک مینار جو باعتبار خوبصورتی اور مضبوطی کے قابل دید ہے پانی کی سطح سے ۱۴۰ فٹ بلند اور لوہے کا بنا ہوا ہے۔

نہر سویز یہ نہر ایک زمانہ میں خاک نہ تھی۔ اِسکے وجود سے ایشیا و افریقہ کے براعظم ملے ہوئے تھے۔ اور مصر کے قافلے خشکی کے رستے سے ملک شام میں آمد و رفت کرتے تھے۔ تیس برس پیشتر فرانس کے ایک نامور انجنیر ڈی لیسپ کو اسکے کھودنے کا خیال آیا۔ ابتداءً تو دنیا کے لوگ خصوصاً انگریز اِسے خبط سمجھتے رہے۔ مگر جب فرانس میں انجنیر مذکور کے ہم خیال و مددگار پیدا ہوئے۔ تو انگریزوں نے بھی بڑی گرمجوشی سے اسکی مالی امداد میں حصہ لیا اور دس برس کے عرصہ میں (۱۸۵۹ء سے ۱۸۶۹ء تک) یہ نہر تیار ہو گئی۔ اسکا کام سعید پاشا خدیو مصر کے زمانہ میں شروع ہوا تھا

اور سمعیل پاشا کے زمانہ میں خاتمہ کو پہونچا تیس کروڑ روپیہ اُس پر صرف ہوا۔ مصارف کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ تیس ہزار مزدور جو کام پر لگائے گئے تھے۔ اُنکے لئے میٹھا پانی دریائے نیل سے آتا تھا۔ اور روزمرّہ اُن میں تقسیم ہوتا تھا۔ غرض ڈی لیسپ کی اعلیٰ لیاقت اور اُلوالعزمی سے اس خاکنا میں سمندر کا پانی موجزن ہوا۔ جو اب تمام دنیا میں نہر سویز کے نام سے مشہور ہے اور عرب اسکو قنال کہتے ہیں جو انگریزی لفظ کنال کا معرّب ہے۔

اس نہر کے بننے سے بحیرہ قلزم اور بحیرہ شام باہم مل گئے اور جہازوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس سے پیشتر یورپ کے جہاز افریقہ کے گرد چکر لگاتے ہوئے ہندوستان اور چین و جاپان کو جاتے تھے۔ اور انہیں ۱۱۳۷۹ میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب اس نہر کی بدولت صرف ۷۶۲۸ میل کا سفر رہ گیا ہے۔ جس کو انگلستان و ہندوستان کے درمیان ڈاک کے تیز رو جہاز تیرہ دن میں طے کر لیتے ہیں۔ اس نہر کا طول ۹۹ میل اور عرض اس قدر کم ہے کہ ایک ایک جہاز باری باری سے اسمیں گذرتا ہے۔ اور اتنا آہستہ چلتا ہے کہ یہ مسافت سولہ گھنٹے میں طے ہوتی ہے۔ مزید احتیاط کی غرض سے رات کو برقی روشنی بھی کی جاتی ہے جس سے تمام نہر اور سواحل بقعۂ نور بنجاتے ہیں۔

نہر کے دونوں کناروں پر سویز اور پورٹ سعید میں نہر کی مالک کمپنی کا ایک ایک دفتر ہے جس کا فرض ہے کہ جہازوں کی آمد برآمد میں تعمیل قواعد کا لحاظ رکھے اور جہازوں کے مال اور مسافروں کی پڑتال کرے۔ نیز جو مسافر یا مال بعد روانگی جہاز کسی بندرگاہ سے چڑھائے جائیں اُن کا محصول وصول کرے۔

محصول بیر بحری کی شرح فی مسافر دس فرنک ہے جو ہمارے ہاں کے ۴؍ کے مساوی ہوتے ہیں۔ بمبئی۔ عدن وغیرہ بندرگاہوں سے چلنے والوں سے یہ محصول ٹکٹ کی قیمت میں شامل کر کے وصول کیا جاتا ہے۔ اور جہاز والے بطور خود کمپنی کو ادا کر دیتے ہیں۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں صرف ۴۵۶ جہاز اس نہر سے گذرے تھے۔ جنکی آمدنی دو لاکھ ۶ ہزار ۳ سو تہتر پونڈ تھی۔ مگر سنہ ۱۸۹۹ء میں ۳۶۰۷ جہازوں نے عبور کیا جنکے محصول سے ۳۶ لاکھ ۵۲ ہزار ۷ سو اکیاون پونڈ کی آمدنی کا اندازہ ہوا ہے۔ اس آمدنی میں سے کچھ حصہ گورنمنٹ مصر کو بھی ملتا ہے

چنگی خانہ سویز

دس دن کے بعد بحری سفر ختم ہونے پر ہم نے سویز کی اسلامی سرزمین میں قدم رکھا۔ جو سلطنت مصر کا ناکہ ہے۔ خشکی پر اُترتے ہی سب سے پہلے ہمیں چنگی خانہ جانے کی ہدایت ہوئی۔ چنگی خانہ کو ترکوں کی اصطلاح میں جمرک یا گمرگ کہتے ہیں۔ اس جگہ گورنمنٹ مصر کے ماتحت بڑا عملہ متعین ہے جو تجارتی مال کی پڑتال کر کے محصول وصول کرتا ہے۔ چنگی کی شرح اس جگہ ۸ روپیہ ۵ ر یا پائی فیصدی ہے۔ میرے پاس کوئی تجارتی مال نہ تھا۔ اس لئے جلد مخلصی ہو گئی۔ اور قلی میرا اسباب شہر میں لے آئے جو سویز کے نام سے مشہور ہے۔

چنگی خانہ میں ایک پارسی سُہراب جی نامی ہے جو کسی زمانہ میں امرتسر رہ چکا تھا۔ یہ شخص ہندوستان کے مسافروں سے نہایت اخلاق سے پیش آتا ہے۔ جب اِسے معلوم ہوا کہ مَیں ہندوستانی اور بالخصوص امرتسر کا رہنے والا ہوں تو بہت ہی خوش ہو کر مِلا۔ اور جو لوگ اسکے زمانہ اقامت میں امرتسر کے مشاہیر میں سے تھے اُن کے حالات نام بنام پوچھتا رہا۔ واقعی حب وطن ایک

عجب چیز ہے اور جتنا اپنے ملک سے دور ہوتے جائیے ہم وطنی الفت کا دائرہ اُتنا ہی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ ورنہ یوں دیکھئے تو پارسی ہندوستان میں ہندوستانیوں سے الگ ہی رہتے ہیں۔ سُہراب جی کو ع.بی۔ انگریزی۔ اطالین۔ فرانسیسی زبانوں میں بقدر ضرورت اچھی واقفیت ہے۔ اور تجارتی معلومات کی وجہ سے اپنے فرائض تشخیص و قرار داد محصول کے متعلق بڑی خوبی سے انجام دینا ہے۔

شہر سویز یہ شہر مصر کا مشرقی بندرگاہ ہے۔ زمانہ قدیم میں اسکو قلزم کہتے تھے۔ چنانچہ بحیرۂ قلزم اسی کے نام سے مشہور ہے۔ ہندوستان اور چین و جاپان کے تجارتی جہاز ہمیشہ سے اس مقام پر لنگر انداز ہوتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں شہر سویز کی آبادی کم تھی۔ اور یہ کمی زیادہ تر اس وجہ سے تھی کہ میٹھا پانی بڑی دقت سے میسر آتا تھا۔ نہر سویز کی تیاری کے دوران میں میٹھا پانی بہم پہونچنے کا بخوبی انتظام ہو گیا۔ جسکی وجہ سے اب سویز کی آبادی دو چند سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اور روز بدن بڑھتی جاتی ہے۔ اس وقت قریبًا بارہ ہزار آدمی اسمیں سکونت رکھتے ہیں جو زیادہ تر مسلمان اور اہل مصر سے ہیں۔

یہ شہر اگرچہ گورنمنٹ مصر کے زیر حکم ہے مگر ترقی تجارت کے باعث یورپ کی متعدد سلطنتوں کے قنصل (کونسل) اس جگہ مقیم ہیں۔ ایک قنصل شاہ ایران کی طرف سے بھی رہتا ہے۔ یہ سب قنصل قانون بین الاقوام کی پابندی سے اپنی اپنی رعایا کے سیاسی و تجارتی حقوق کی حفاظت و نگرانی کرتے ہیں اور اُن کے باہمی مقدمات کا فیصلہ بھی انہی کے ہاں سے ہوتا ہے۔ جس کا ذکر انتظامی حالات کے تحت میں لکھا جائے گا۔

سویز پہونچنے کے بعد مقامی خصوصیات میں سے جو چیزیں ایک مسافر کو حیرانی میں ڈال دیتی ہیں اُن کا مختصر اندازہ اِن حالات سے ہو سکتا ہے:۔

(۱) وقت کا اندازہ جو غروب اور طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔ جیسے ہمارے اں ہندوستان میں بارہ بجے دن سے بارہ بجے رات تک بارہ گھنٹوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مصریوں میں شام سے طلوع آفتاب تک اور پھر صبح سے غروب آفتاب تک گھنٹے شمار ہوتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی مصری یہ کہے کہ ہم سے دو بجے دن کے ملاقات کرنا تو اسکے یہ معنے ہوں گے کہ آٹھ بجے صبح کے۔

(۲) سکّہ کی حالت۔ اس جگہ بیشتر رواج مصری سکّہ کا ہے۔ جو تین علحدہ علحدہ دھاتوں سے بنایا جاتا ہے۔ سب سے ادنیٰ سکّہ "ملیم" ہے جو تانبے سے بنایا جاتا اور تین پائی کے برابر ہوتا ہے۔ اس سے اوپر چاندی کا سکّہ "قرش" ہے جو شکل میں دونی کے برابر اور ۲ر ۶ پائی کے مساوی ہوتا ہے۔ اس سے اعلیٰ "ریال" ہے جو روپیہ سے شکل اور حجم میں بڑا اور قیمت میں ہے ۲ر کا ہوتا ہے۔ سب سے انتہائی قیمت کا سکہ جنی ہے جسکو مصری اشرفی کہنا چاہئے۔ اسکی قیمت پندرہ روپیہ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام سکّوں میں ایک طرف کو ضرب مصر اور سنہ ہجری نقش ہوتا ہے۔ اور دوسری جانب کو سلطان روم کا طغرا۔

(۳) اختلاف زبان۔ سویز اور تمام بلاد مصر میں عربی زبان بولی جاتی ہے۔ مگر اس کا تلفظ اس قدر بگڑا ہوا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ان لوگوں سے بات چیت کرنے میں پریشان ہو جاتے ہیں۔ نہ ان کی بات سمجھتے ہیں اور نہ ان کو

اپنا مطلب سمجھا سکتے ہیں۔ مثلاً مَا اسمكَ کی جگہ اسمك ایه (تمہارا کیا نام ہے) اِلٰی اَینَ تَرُوحُ کی جگہ تَروُحُ فین۔ (تم کہاں جاتے ہو)

ان مقامی خصوصیات کے علاوہ باشندگانِ سویز کے خصائل اور عادات مسافروں کے واسطے اور بھی زیادہ حیرانی کا باعث ہیں۔ یہاں کے باشندے بہت چالاک اور مسافروں کے ساتھ اکثر عیاری کر جاتے ہیں۔ کشتی سے اُترتے ہی پہلا سلوک مسافر کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ کئی کئی مزدور اسباب کو لپیٹ جاتے ہیں ابتداء میں دو ہوں تو منزلِ مقصود تک جاتے جاتے نصف درجن تک پہونچ جاتے ہیں۔ پھر مزدوری کے لینے میں بڑا تکرار کرتے ہیں۔ مزدوروں کے بعد مسافر خانے والوں سے سابقہ پڑتا ہے جو ہمیشہ زیادہ ستانی کی کوشش کرتے ہیں۔ اور دوچند سہ چند وصول کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ یہ مسافر خانے ہندوستانی سراؤں کی کوٹھڑیوں سے مشابہ ہیں۔ لیکن اُن سے فی الجملہ بہتر اور کسی قدر صاف ہوتے ہیں۔ زمین پر بوریئے کا فرش بچھا رہتا ہے۔ اور پلنگ فوراً لگا دیا جاتا ہے۔ یہاں کی اصطلاح میں ان کو خَان کہتے ہیں۔ کھانے کا ان میں کوئی بندوبست نہیں یہ صرف رات کو ٹھہرنے کا کام دیتے ہیں۔ کھانے کے واسطے نانبائیوں کی دوکانیں ہیں جو صفائی اور سلیقہ میں بہت بڑھی ہوئی ہیں۔ ہر دوکان میں کئی کئی میزیں لگی رہتی ہیں اور ہر میز کے گرد چار کرسیاں رکھی ہوتی ہیں لوگ انہی پر بیٹھکر کھانا کھاتے ہیں۔

مزدوروں دوکانداروں کی طرف سے جو تکلیفیں پہونچتی ہیں وہ مسافرانِ درجہ سوم کی تقدیر میں لکھی ہیں۔ پہلے اور دوسرے درجے کے مسافروں کو اس قسم کی دقتیں بہت کم پیش آتی ہیں۔ جہاز سے اُترتے ہی اُن کے واسطے

کمپنی کی کشتی آجاتی ہے۔ اور کمپنی ہی کی معرفت مزدور ملواکر سامان جنگی خانہ سے
ہوٹل میں پہونچا دیا جاتا ہے۔ یہ ہوٹل انگریزی وضع کے ہیں۔ ان میں شب باشی
اور کھانے کا انتظام مکمّل ہوتا ہے۔ اور ضرورت و آسائش کی ساری چیزیں
جو ہندوستان کے اچھے ہوٹلوں میں نظر آتی ہیں وہ یہاں بھی مہیّا ہوتی ہیں۔

پاسپورٹ کا جھگڑا

مجھے جنگی خانے سے ہوٹل میں آئے ہوئے تھوڑی
دیر ہوئی تھی کہ گورنمنٹ مصر کا ایک اہلکار جو پاسپورٹ کے دفتر میں مامور رہے
مسافروں کے پاس پورٹ دیکھنے کو آیا۔ اور باری باری سے سب کے پاسپورٹ
دیکھے۔ معلوم ہوا کہ سویز اور مصر کے تمام بندرگاہوں میں مسافروں کے پاسپورٹ
دیکھکر اُن کو اندرون ملک میں داخل ہونے کی اجازت دیجاتی ہے اور جس کے
پاس یہ سند نہ ہو اُسکو روکا جاتا ہے۔ اہلکار رندکور کو جب معلوم ہوا کہ میرے پاس
پاسپورٹ نہیں ہے تو اس نے میرے ملک کا نام دریافت کیا۔ اور انگریزی
رعایا کا نام سننے پر کہا کہ جب تک پاسپورٹ کا فیصلہ نہ ہولے اسی جگہ ٹھہرنا پڑیگا
کل صبح کو آپ میرے پاس آئیں کہ مَیں آپکو برٹش قنصل کے سامنے پیش کروں۔
مجھے اس حکم کے سننے سے فی الجملہ تشویش ہوئی اور مَیں اُسی دن سُہراب جی کی
کوٹھی پر گیا۔ سُہراب جی بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اور اپنی یورپین خاتون
سے میری شناسائی کرائی۔ بہت دیر تک میری اُنکی باتیں ہوتی رہیں۔ سُہراب جی
ہم دونوں میں ترجمان تھے۔ خاتمہ پر سُہراب جی کو میں نے اپنا قصّہ سُنایا۔ اُنہوں
نے مجھے بہت کچھ تسلّی دلائی اور کہا کہ مَیں آج ہی شب کو انگریزی قنصل سے
مِلکر آپ کی بابت اُسے مطمئن کردوں گا۔ مَیں ان کا شکریہ ادا کرکے چلا آیا۔ اور

دوسرے دن علی الصباح پاس پورٹ کے دفتر میں گیا۔ وہ اہلکار پہلے سے وہاں موجود تھا۔ اُس نے میرا نام ولدیت اور سکونت پوچھکر ایک نقشہ کی خانہ پُری کی اور مجھے دے کر کہا کہ انگریزی قنصل کے پاس لے جایئے میں نے بھی ایک چٹ انگریزی میں تحریر کر کے اہلکار مذکور کے ذریعہ اُسی لفافہ میں ڈلوادی اور قنصل کے ہاں لفافہ لے کر پہونچا۔ قنصل نے کاغذات پڑھکر دریافت کیا کہ یہ چٹ کس کی لکھی ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ میری۔ پھر پوچھا کہ تمہیں کوئی شخص اس جگہ جانتا ہے۔ میں نے کہا کہ سُہراب جی افسر چُنگی۔ قنصل کو جب میرے انگریزی رعایا ہونے کی نسبت اطمینان ہوگیا اور غالبًا اس اطمینان میں سُہراب جی کی تقریر بھی مؤید ہوگی۔ تو اُس نے نقشہ پر دستخط کر کے لفافہ مجھے دے دیا۔ اور مَیں اُسے پاس پورٹ کے دفتر میں لے آیا۔ اہلکار نے حکم پڑھکر مجھے کہا کہ انگریزی قنصل نے قاہرہ جانے کی اجازت دیدی ہے اب جس وقت آپ کا جی چاہے چلے جائیں۔ میں اُسی وقت ہوٹل میں گیا۔ معلوم ہوا کہ سویز سے صبح و شام دو مرتبہ ریل[1] قاہرہ جاتی ہے۔ اتفاقًا روانگی کا وقت قریب تھا۔ میں ریل پر سوار ہو کر قاہرہ چلا اور سات گھنٹے میں وہاں پہونچا۔

---

[1] اس ملک کی ریل کے حالات اپنے موقعہ پر درج ہونگے۔

قاہرہ کے حالات

میں ۱۰ مئی ۱۸۹۸ء کو قاہرہ پہونچا۔ اور برابر ایک برس تک یہاں مقیم رہا۔ اس زمانے میں شہر اور عمارتوں کے حالات۔ باشندوں کے اوضاع واطوار۔ مقامات قابل سیر۔ تعلیم کی کیفیت۔ گورنمنٹ مصر کا ملکی انتظام۔ آمدورفت کی راہوں کے متعلق جو کچھ مجھے معلوم ہوا۔ حب وطن مقتضی ہے کہ اُن سب کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اس جگہ درج کیا جائے۔ تاکہ ناظرین کو سلسلہ وار حالات دریافت کرنے کا موقعہ ملے۔

آب وہوا میں جب ہندوستان سے سفر کرنے کو تھا تو میرے بعض دوست مصر کی سخت گرمی سے مجھکو ڈراتے تھے۔ لیکن یہاں پہونچنے اور کچھ عرصہ قاہرہ میں مسلسل قیام کرنے سے معلوم ہوا کہ اُن کی یہ رائے کلیہ طور پر صحیح نہ تھی۔ اگرچہ یہ ملک منطقہ حارّہ کے قریب ہے۔ مگر بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ شام جو اس کے مشرق اور شمال میں واقع ہیں اور نیز دریائے نیل جو مصر کی زمین کو جنوباً وشمالاً سیراب کرتا ہوا گذرتا ہے ان کے باعث سے یہاں کی حرارت ناگوار معلوم نہیں ہوتی۔ باوجودیکہ جون۔ جولائی اور اگست میں اس جگہ بارش نہیں ہوتی۔ اور دن کو آفتاب کی حرارت بھی تیز ہوتی ہے۔ مگر رات کو شمال مغربی ہواؤں کے چلنے سے خنکی ہو جاتی ہے۔ یہاں کے لوگ اسی خنکی کے باعث اکثر اوقات موسم گرما میں رات کے وقت مکانوں کے اندر سوتے ہیں۔

قاہرہ سے شمالی شہروں کی ہوا موسم گرما میں بہت زیادہ لطیف ہوتی ہے اور اس آب وہوا کی عمدگی کا یہ نتیجہ ہے کہ پیداوار ارضی بہت عمدہ اور لوگ خوبصورت ہوتے ہیں۔ لیکن جو شہر جنوب کی طرف ہیں اُن میں گرمی کے آثار زیادہ محسوس

ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ وسط افریقہ کی گرمی کی برداشت کرنی سخت مشکل ہے۔ اوران ممالک کے لوگ اکثر سیاہ رنگ اور بدشکل ہوتے ہیں۔

مصر کا موسم سرما یورپ اور امریکہ کے دولتمندوں کے واسطے بڑی نعمت ہے ہر سال صدہا سیاح اپنے ملک کی سخت سردی اور مصر کی عمدہ آب وہوا کے باعث یہاں چلے آتے ہیں۔ ان سیاحوں کی بدولت تاجروں کو موسم سرما میں خوب آمدنی ہوتی ہے۔

باشندگان مصر قاہرہ اور تمام ملک مصر میں اکثر تین قسم کے لوگ آباد ہیں۔ عرب۔ ترک اور قبطی۔ عرب اُن قبائل عربیہ کی اولاد سے ہیں جو فتح اسلام کے بعد یہاں آکر آباد ہوئے۔ ترک غالباً سلطنت عثمانیہ کے اُن فتحمندوں کی اولاد سے ہیں جو مصر پر قابض ہونے کے وقت یہاں آئے تھے قبطی لوگ قدما مصر کی یادگار ہیں۔ پہلی دونوں قومیں مذہب اسلام کی تابع ہیں اور اکثر امام شافعیؒ کے مذہب کے پیرو ہیں۔ اور قبطیوں میں بیشتر عیسائی اور کچھ یہودی بھی ہیں۔

یہی تین قومیں عرصہ دراز سے ملک مصر میں مقیم چلی آتی تھیں۔ مگر انیسویں صدی سے یہ ملک مختلف اقوام کا مرکز بن گیا ہے۔ اور بہت سے غیر ملکوں کے لوگ اس میں آباد ہو گئے ہیں۔ جن کو یہاں کی حکومت "اجنبی" کے لفظ سے نامزد کرتی ہے۔ ان اجنبیوں میں فرنگستانی اور امریکن لوگوں کے علاوہ طرابلس الغرب۔ ٹونس۔ مراکو۔ الجزائر۔ سوڈان۔ شام۔ ٹرکی۔ ایران۔ بخارا کے اہل اسلام اور ہندوستان کے ہندو مسلمان موجود ہیں۔ اور کہیں کہیں کوئی افغان بھی نظر آجاتا ہے۔

سب سے آخری مردم شماری جو ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا ہے

کہ مصر میں ۹۷ لاکھ ۳۴ ہزار باشندے آباد ہیں جنمیں سے ۸۹ لاکھ ۷۹ ہزار مسلمان۔ ۷ لاکھ ۳۰ ہزار عیسائی اور ۲۵ ہزار یہودی ہیں۔ اس مجموعی تعداد میں سے ایک لاکھ ۱۲ ہزار اجنبی ہیں۔ جنکی تعداد لارڈ کرومر معتمد دولت انگریزی نے اپنی گذشتہ رپوٹ میر اس طرح بیان کی تھی۔

نام ملک	تعداد باشندگان	نام ملک	تعداد باشندگان
یونان	۳۸ ہزار ایک سو ۷۵	آسٹریا	۷ ہزار ایک سو ۲۳
اٹلی	۲۴ ہزار ۴ سو ۶۷	روس	۳ ہزار ایک سو ۹۳
انگلستان	۱۹ ہزار ۵ سو ۵۷	جرمنی	ایک ہزار ۲ سو ۷۷
فرانس	۱۴ ہزار ایک سو ۵۵	دیگر ممالک کے لوگ	۴ ہزار ۵ سو ۵۵

شہر کی کیفیت شہر قاہرہ دریائے نیل کے مشرقی کنارے پر سویز سے چھہتر میل مغرب کو اور اسکندریہ سے ۱۱۲ میل جنوب مشرق کو واقع ہے۔ اس کی بنیاد جوہر نامی ایک شخص نے ۳۵۹ھ مطابق ۹۶۹ء میں ڈالی تھی۔ یہ شخص جزیرہ سسلی کا رہنے والا اور مصر کے پہلے خلیفہ فاطمی المعز لدین اللہ کا غلام تھا لیکن اپنی ذاتی لیاقت سے ترقی کرتے کرتے اپنے آقا کے زمانے میں دولت فاطمیہ کا سپہ سالار بن گیا تھا۔ بنیادی پتھر کسی ایسی ساعت سعید میں رکھا گیا کہ ساڑھے نوسو برس گذرنے پر بھی اسکی عظمت وشوکت بدستور قائم ہے۔ بلکہ ایک اعتبار سے دیکھو تو پہلے سے روز افزوں ترقی پر ہے۔ اس وقت یہ مصر اور بر اعظم افریقہ کے سب شہروں سے بڑا اور ملک مصر کا دار الحکومت ہے۔ خدیو معظم مصر کے فرمانروا۔ ان کے وزراء۔ اور سلطنت کے دفاتر سب اسی شہر میں ہیں۔ سال گذشتہ (۱۸۹۷ء) کی مردم شماری کے

مطابق اس کی آبادی مع مضافات کوئی ۵ لاکھ ۷۰ ہزار دریافت ہوئی ہے جسمیں سے ۲۵ ہزار کے قریب ممالک غیر کے باشندے ہیں۔

قاہرہ کا کچھ حصہ میدان میں آباد ہے۔ اور کچھ ایک پہاڑ کی سطح پر فصیل جو شہر کے گرد بنائی گئی ہے وہ کوئی سات میل کے دور میں تھی۔ مگر کچھ عرصہ بعد فصیل کے باہر آبادی بڑھنی شروع ہوگئی۔ اور اب اصل آبادی ان مضافات سے ملکے ایک بہت بڑا شہر بن گیا ہے۔ شیخ ابن بطوطہ آٹھویں صدی ہجری کے نامور سیاح کے زمانۂ سیاحت میں اس شہر کی آبادی جس قدر ترقی پر تھی اُس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف سقے جو اُونٹوں پر پکھالیں لاد کر پانی شہر میں لاتے تھے اُنکی تعداد بارہ ہزار اور لکڑی فروشوں کی دوکانیں تیس ہزار تھیں۔

اندرون شہر سب سے پُر فضا مقام ازبکیّہ ہے جو پہلے ایک ویران جگہ تھی۔ مگر اب وہاں ایک بہت خوبصورت باغ شہر کو رونق دے رہا ہے مصری اس کو "جُنَینہ ازبکیہ" کہتے ہیں۔ اس کے اندر تالاب اور باہر چاروں طرف سوداگروں کی بہت بارونق اور اعلیٰ درجے کی دوکانیں۔ ہوٹل۔ بنک۔ سرکاری دفاتر ہیں جو پیرس اور لنڈن کی عمارات کی جھلک دکھا رہے ہیں۔

شہر میں جس قدر عمدہ قہوہ خانے ہیں ازبکیّہ ان کا ممتاز مقام مانا گیا ہے یورپین اور امریکن سیاحوں کے ٹھہرنے کے واسطے اعلیٰ درجہ کے نفیس اور شاندار ہوٹل اسی موقعہ پر ہیں۔ سڑکوں پر گیس کی روشنی ہوتی ہے۔ آبرسانی کا انتظام نلکوں کے ذریعہ سے ہے۔ شہر کے بڑے بڑے حصوں میں برقی ٹریموے جاری ہے۔ امرا اور تاجروں کے مکانوں پر ٹیلیفون لگے ہوئے ہیں۔ غرض عمارتوں کی خوشنمائی

اور مکانوں کی آراستگی و صفائی سے یہ شہر یورپ کے بڑے بڑے شہروں کا مدّ مقابل مانا گیا ہے۔ بلکہ امرا کے گھروں میں پائین باغ ہونے سے یورپ کے شہروں پر بھی فوق لے گیا ہے۔

یہ ترقیات بیشتر اسمٰعیل پاشا خدیو مصر کی یادگار ہیں۔ جس نے اس شہر کی آراستگی میں اپنی تمام توجہ صرف کر دی تھی۔ مگر باوجود اِن ترقیات کے شہر کی تنگ گلیوں اور غربا کے چھوٹے چھوٹے مکانوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی اصلاحات کی گنجائش ہے۔

عمارات اندرون شہر میں سے ایک مشرقی بازار "خان خلیل" کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہندوستان۔ ایران۔ شام۔ استنبول۔ اور اَور ملکوں کے سوداگر اپنے اپنے ملک کی بے نظیر دستکاریاں اور ایشیا کے عجائبات قدیمہ کی تجارت کرتے ہیں۔ یورپ و امریکہ کے بڑے بڑے سیاح جو قاہرہ کی سیر کو آتے ہیں وہ ممالک مشرقی کے مصنوعات خریدنے کے واسطے اس بازار سے ایک دفعہ ضرور گذرتے ہیں۔ اور یہاں سے گراں بہا چیزیں خرید کر اپنے وطن کو لے جاتے ہیں۔ اس بازار کے اندرونی حصے پر چھت پٹی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے سورج کی تپش ان دکانوں میں کبھی داخل نہیں ہوتی۔ اس شہر میں بیشمار مسجدیں ایسے اعلیٰ پیمانہ پر بنی ہوئی ہیں جو عربوں کی صناعی کی خاص یادگار ہیں۔ اِن کی تفصیل عنقریب بیان کی جائے گی۔

مضافات شہر مضافات قاہرہ میں سے بولاق دریائے نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ پیشتر یہ جزیرہ تھا۔ مگر اب خشکی سے پیوند ہو کر نیل کا بندرگاہ بن گیا ہے

صعید (مصر) سے جو جہاز مال کے بھرے ہوئے یہاں آتے ہیں اسی جگہ لنگر انداز ہوتے ہیں۔ روئی کاتنے۔ کپڑا بننے۔ اسلحہ بنانے اور ڈھالنے کے کارخانے بھی اس جگہ موجود ہیں۔ گورنمنٹ مصر کا ایک چھاپہ خانہ بھی اس جگہ ہے جس کو "مطبع میری" کہتے ہیں۔ اخبار المؤید۔ اللوا۔ الہلال کے دفاتر بھی بیرونی آبادی میں ہیں۔ ان سب کے مفصل حالات ایک مستقل فصل میں درج ہوں گے۔

مصر العتیقہ (مصر قدیم) بھی منجملہ مضافات قاہرہ اور نیل کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ خلفائے فاطمیین کی فتوحات سے پہلے اسکو فسطاط کہتے تھے۔ یہ شہر عمرو بن عاص فاتح مصر کی یادگار ہے۔ جسمیں عربوں کی پہلی بستی ۲۰ھ ہجری میں مصر میں قائم ہوئی تھی۔ قاہرہ کی تعمیر سے پیشتر اس کی آبادی اور تمول بہت ترقی پر تھا۔ اب بھی اس میں عمدہ عمارتیں۔ باغات اور لب ساحل عمدہ عمدہ محل موجود ہیں جہاں خاصکر مصر کے امرا طغیانی نیل کے زمانے میں آکر ٹھہرتے ہیں۔

قبہ وہ مقام ہے جہاں خدیو معظم کے محلات شاہی بنے ہوئے ہیں اور شہر سے کچھ فاصلے پر ہے۔ عباسیہ کی آبادی فصیل شہر کے متصل اور دو میل لمبائی میں چلی گئی ہے۔ اس میں رصد خانہ اور فوجی بارکیں موجود ہیں۔ اور یہ دونوں آبادیاں آب ہوا کی عمدگی کی وجہ سے مشہور ہیں۔

مسجدیں [1] یہاں کی مسجدیں بہت قدیم اور عمدہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کی تعمیر کا سلسلہ صحابہؓ کرام کے زمانہ سے چلا آتا ہے۔ سب سے پہلے جو مسجد تعمیر ہوئی وہ جامع عمروؓ ہے اس کو عمرو بن عاص فاتح مصر نے ۲۱ھ میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ جامع عربوں کی قدیم وضع کی

[1] مصری محاورہ میں ہر ایک مسجد کو جامع کہتے ہیں۔ کوئی خصوصیت نماز جمعہ کی نہیں ہے۔

عمارت ہے۔ اس کا نقشہ بہت ہی سادہ ہے۔ جو گلکاریاں۔ آرائشیں اور بیل بوٹے کہ عربوں نے فتوحات دنیا کے بعد ایجاد کیئے۔ وہ اس میں بالکل نہیں ہیں۔ خلفائے راشدین کے عہد بلکہ بنی اُمیہ کے اخیر زمانے تک تمام فسطاط میں یہی ایک مسجد تھی مگر بنی عبّاس کی حکومت کے ساتھ مسجدوں کی تعمیر شروع ہوگئی۔ اس عہد کی سب سے زیادہ مشہور مسجد جامع طولون ہے۔ جو احمد بن طولون فرمانروائے مصر کے حکم سے ۲۶۳ھ میں تعمیر ہوئی تھی۔ گو یہ مسجد بھی سادی وضع کی ہے مگر جامع عمرو کے مقابلے میں زیادہ شاندار ہے۔ مورّخین کی رائے ہے کہ اس مسجد کی تعمیر میں پندرہ لاکھ روپے کے قریب صرف ہوئے تھے۔

فسطاط کے بعد جب قاہرہ مرکز حکومت قرار پایا تو اس وقت کی سب سے پہلی تعمیر شدہ مسجد جامع ازہر ہے۔ جو ۳۵۹ھ کے ساتھ اپنے بانی المعز لدین اللہ کی یادگار کو تازہ کرتی ہے۔ اور تمام مساجد اسلامیہ میں مشرقی علوم کی درس و تدریس اور کثرت طلبا کے باعث نہایت مشہور ہے۔ اور بلحاظ آرائش اپنی ماسبق مسجدوں پر فائق ہے۔ سب سے زیادہ خوبصورت اور عربی طرز عمارت کے زمانۂ عروج کی تعمیر شدہ مسجد جامع حسن ہے جو سلطان حسن کے حکم سے ۷۵۷ھ میں تعمیر ہوئی۔ اور قاہرہ کی عمدہ ترین عمارات میں سے ہے۔ کتب تاریخ میں لکھا ہے کہ اس مسجد کے مصارف تعمیر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تین سال تک برابر کام جاری رہا۔ اور نو ہزار درہم یومیہ روزانہ خرچ ہوتا تھا۔

جامع ازہر کے سوا اکثر پرانی مسجدیں خصوصاً جامع عمرو اور جامع طولون جو سلاطین مصر کی عظمت اور عربوں کی صنعت یاد دلا رہی ہیں۔ بالکل بے مرمت

پڑی ہیں۔ جامع عمرو کے صحن کے گرد جو عمارتیں تھیں ان میں سے صرف دو طرف کی رہگئی ہیں۔ اور ستونوں کی قطاریں بھی شکستہ ہوگئی ہیں۔ چونکہ ہر سال ماہ رمضان میں آخری جمعہ کی نماز اس جگہ پڑھی جاتی ہے اس لئے اسکی حالت پھر بھی کچھ اچھی ہے مگر جامع طولون تو بالکل ویران ہے۔ اگر ان مساجد کا یہی حال رہا۔ اور گورنمنٹ مصر کی طرف سے کچھ نگرانی نہ ہوئی تو زمانہ کی دستبرد سے احتمال ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کی جگہ صرف ایک تودۂ خاک نظر آئیگا۔

ترکوں کے تسلط کے بعد جو مسجدیں تعمیر ہوئیں ان میں سب سے بڑی وسیع جامع محمد علی پاشا ہے۔ جو قلعہ میں پہاڑی کی چوٹی پر بنی ہوئی ہے۔ اس کا زمانہ تعمیر غالبًا ساٹھ سال سے متجاوز نہ ہوگا۔ یہ مسجد بڑی شاندار ہے۔ اور اسکے دو مینار اس قدر بلند ہیں کہ دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ مسجد کے ایک کونہ میں محمد علی پاشا کی قبر ہے۔ اس مسجد کی عمارت دیکھنے سے وہ فرق معلوم ہوتا ہے جو عربوں اور ترکوں کی صناعی میں ہے۔ اور باہم مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی عمارات عربی عمارات کے مقابلہ میں چنداں قابل تعریف نہیں۔

تمام پرانی مسجدیں ازہر کے سوا اندر باہر سے مسقف ہیں۔ بیرون مسجد وضو کے واسطے حوض اور ٹونٹیاں ایک طرف کو بنی ہوئی ہیں۔ مسجدوں کے گنبد خاص مشرقی وضع کے ہیں۔ اور شمالی سمت کو ایک بہت لمبا مینار بنا ہوا ہوتا ہے جس میں اوپر جانے کے واسطے چکر دار سیڑھیاں ہوتی ہیں۔ منارے اکثر دو منزلے سہ منزلے ہوتے ہیں۔ اور ہر منزل میں منارہ کے گرد ایک چھجا ہوتا ہے۔ موذن اس چھجے پر کھڑا ہو کر اذان دیتا ہے۔ اور ہر ایک جلے کے بعد آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس طرح

سارے منارے کے گرد چکر لگاتا ہوا اذان کو ختم کرتا ہے۔

اس وقت نئی پرانی مسجدوں کی تعداد پانسو کے قریب ہے۔ مسجدوں میں امام۔ موذن۔ اور خادم جس قدر ہیں۔ اُن سب کو محکمہ اوقاف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ فرش اور روشنی کا سامان جو مطلوب ہو وہ بھی مد اوقاف سے ملتا ہے بعض مسجدوں میں ترکی قالین کا فرش ہے۔ اور روشنی کے واسطے جھاڑ فانوس آویزاں ہیں۔ ہندوستان کی طرح اہل محلہ کی طرف سے کسی قسم کی مدد ان کو نہیں ملتی۔ اور نہ محلہ والوں کو عملہ مسجد کی بحالی برخاستگی میں کوئی دخل ہے۔

مزارات قاہرہ میں اہلبیت کرام اور بزرگان دین کے چند مزار ہیں۔ اُن میں سب سے بڑی مقدس زیارت گاہ سید الشہدا حضرت امام حسین علیہ السلام کی ہے۔ حضرت امام صاحب رضؓ کا واقعہ تو ۶۱ھ میں نجف اشرف کے میدان میں ہوا تھا جو کوفہ کے قریب ہے۔ مگر آپ کا سر مبارک دمشق میں یزید خلیفۂ وقت کے پاس لایا گیا تھا۔ اور وہیں مسجد اموی میں دفن ہوا تھا۔ المعزلدین اللہ مصر کے پہلے فاطمی خلیفہ کو جب ملک مصر اور شام پر تسلط ہوا۔ تو وہ امام صاحب کا سر مبارک شام سے قاہرہ میں لے آیا۔ اور اس جگہ بڑا عظیم الشان مقبرہ تعمیر کیا۔ اس مقبرہ کے ساتھ ایک مسجد ہے۔ جو جامع سیدنا حسینؓ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقبرہ اور مسجد کی عمارت بہت نفیس اور اس کے مصارف کا انتظام بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ مصری لوگ اس مقبرہ کی زیارت کرنے اور دعا مانگنے کی غرض سے باوقات مختلفہ آتے رہتے ہیں۔ منجملہ مزارات مقدسہ کے حضرت سیدہ نفیسہ بنت زید بن علی بن امام حسینؓ کی قبر ہے۔ یہ درگاہ مقام اجابت دعا ہے۔ مصر کے فاتح عمرو بن عاص کا مقبرہ بھی اسی

جگہ ہے جو ۳۰۲ھ میں فوت ہوئے تھے۔ حضرت امام شافعی کے مقبرہ کا فخر بالخصوص اسی سرزمین کو حاصل ہے۔ جن کا مذہب تمام ملک مصر میں پھیلا ہوا ہے۔ آپ کا انتقال ۲۰۴ھ میں ہوا تھا۔

تکیے جو مسافر بے سروسامان اس ملک میں آجاتے ہیں اُن کے قیام کے واسطے متعدد تکیے موجود ہیں۔ تکیہ کا لفظ غالباً مسافر خانہ کا مراوف ہے۔ جہاں مسافر بے کرایہ اور بغیر کسی قسم کے اعتبار کے رہ سکتا ہے۔ ہر ملک کے واسطے علیحدہ علیحدہ تکیہ موجود ہے۔ اور ہر تکیئے میں اُسی ملک کا ایک شخص منتظم تکیہ ہوتا ہے جسکو مصریوں کی اصطلاح میں شیخ التکیہ کہتے ہیں۔ شیخ ابن بطوطہ کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں ان مکانات کو خانقاہ کہتے تھے۔ اور صوفیا کے ذکر و شغل کے واسطے بنائے گئے تھے۔ شیخ نے ان خانقاہوں کے حالات بہت دلچسپ لکھے ہیں۔ جو ناظرین کی تفریح کی غرض سے یہاں لکھے جاتے ہیں

"اس شہر میں خانقاہیں بکثرت ہیں۔ یہاں کے امرا علی العموم خانقاہوں کے بنوانے کی طرف رغبت رکھتے ہیں۔ یہاں کی ہر ایک خانقاہ ایک خاص جماعت فقرا کے واسطے مخصوص ہے۔ جماعات فقرا اکثر عجمی ہی لوگوں کی ہیں۔ جو طریق و آداب سلوک و تصوّف کے بڑے ماہر و عارف ہیں۔ ہر خانقاہ کا ایک شیخ اور ایک مہتمم ضرور ہوتا ہے۔ ان کے امور کی ترتیب و تنظیم تعجب خیز و حیرت انگیز ہوتی ہے۔

اُن کے لازمہ عادات سے ہے کہ صبح ہوئی اور خادم خانقاہ فقرا حاضرین خانقاہ کے پاس آکر ہر شخص سے کھانے کی بابت دریافت کرتا ہے۔ جس نے

جس قسم کے کھانے کی فرمائش کی اُسی قسم کا کھانا وہ اُس کے واسطے تیار کر دیتے ہیں۔ اور جب وہ لوگ کھانا کھانے کے واسطے جمع ہوتے ہیں تو ہر شخص کا کھانا علحدہ علحدہ برتنوں میں اس کے سامنے چُن دیتے ہیں۔ ایک کے کھانے میں دوسرا شریک نہیں ہوتا۔ دن بھر میں دوبار کھانا ملتا ہے۔ اس روزمرہ کھانے کے مصارف کے علاوہ درویشوں کے جاڑے اور گرمی دونوں موسم کے کپڑے کا خرچ بھی خانقاہ ہی کی طرف سے ملتا ہے۔ اور متفرقات مدد خرچ کے واسطے ہر درویش کو دس روپیہ سے لے کر تیس روپیہ ماہوار تک نقد ملتا ہے۔ اور ہر جمعرات کو میٹھے کھانے کیواسطے علحدہ خرچ مقرر ہے ۔ صابون۔ دھوبی۔ اور روشنی و جراح و حجام کے مصارف ان سب مصارف کے علاوہ ہیں۔ جو خانقاہ ہی کے ذمہ ہیں۔ اور یہ سارے صوفی اور درویش سب کے سب غریب الوطن اور ارباب تجرد ہیں۔ لعض درویش جو مجرد نہیں ہیں۔ بلکہ اہل وعیال بھی رکھتے ہیں اُن کے واسطے خانقاہیں جداگانہ ہیں۔

ان سب درویشوں کے واسطے لازمی امور یہ ہیں کہ پنج وقتہ نماز باجماعت مسجد میں اداکریں۔ اور شب کو اُن کا قیام خانقاہ سے باہر نہ ہو۔ اور خانقاہ کے اندر قبہ میں جمع ہونا بھی ان کے لوازمات سے ہے ۔ روزمرہ طریقہ ان کا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے ہی خاص سجادہ پر بیٹھتا ہے۔ اور صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سورۂ فتح اور سورۂ ملک اور سورۂ عم ان کا روزمرہ وظیفہ ہے۔ قرآن شریف کے پارے پارے کی جلدیں علحدہ لائی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص ایک ایک پارہ پڑھتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی پورے قرآن ختم ہوتے ہیں۔ اُسکے بعد اذکار و اشغال میں مصروف ہوجاتے ہیں۔

پھر قاری لوگ اہل مشرق کی وضع پر قرأت کرتے ہیں۔ اسی طرح روزانہ ورد عصر کی نماز کے بعد بھی ہوتا ہے۔

جب کوئی نیا درویش کسی خانقاہ میں آتا ہے۔ تو صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ کمر بستہ دائیں ہاتھ میں جریب لوہے کی لمبی شام نوکدار لگی ہوئی اور بائیں ہاتھ میں لوٹا۔ کندھے پر جا نماز خانقاہ کے دروازے پر پہونچا۔ دربانوں نے مہتمم خانقاہ کو فوراً اطلاع دی۔ کہ نیا درویش فلاں دروازے پر آیا ہے۔ مہتمم اطلاع پاتے ہی نکل آتا ہے اور اس سے استفسار حال کرتا ہے۔ کہ کس ملک سے آتے ہو؟ راہ میں کن کن خانقاہوں میں قیام کا اتفاق ہوا؟ اُن خانقاہوں کے شیوخ کے کیا کیا نام تھے۔ جب اس کے بیان کی صحت معلوم ہو گئی تو اس کو خانقاہ کے اندر لیجاتے ہیں۔ اور مناسب جگہ پر سجادہ اُسکے واسطے بچھایا جاتا ہے۔ اور مصفا جگہ اُس کو دیجاتی ہے۔ وہ نووارد درویش خانقاہ میں داخل ہونے کے بعد از سرِ نو وضو کرتا ہے اور اپنے سجادہ پر آتا ہے۔ اور درمیان سجادہ کے کھڑے ہو کر اول دوگانہ نفل ادا کرتا ہے۔ بعد اُس کے شیخ خانقاہ اور جملہ حاضرین سے مصافحہ کرتا ہے۔ اور اُن سب کے زمرے میں بیٹھتا ہے — ان کا دستور یہ ہے کہ جمعہ کے روز خانقاہ کے خدمتگار سب درویشوں کے سجادے ان کی جگہوں سے اُٹھا لے جاتے ہیں۔ اور مسجد میں لے جا کر اُن کے واسطے بچھا دیتے ہیں۔ بعد اس کے سب درویش مجتمع ہو کر شیخ کے ہمراہ مسجد میں جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے اپنے سجادہ پر نماز پڑھتا ہے۔ بعد فراغ نماز حسب عادت قرآن شریف کا دور پڑھتے ہیں۔ پھر سب اکٹھے ہو کر بہمراہی شیخ خانقاہ میں واپس آجاتے ہیں"۔

مجھے صرف ہندی تکیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت دس بارہ مسافر اس میں موجود ہیں۔ دو تین بنگالی اور پوربی بیس بیس برس سے پڑے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت بہت ذلیل ہے۔ بعض آدمی کاغذوں کے پھول۔ چڑیاں وغیرہ بناکر بیچتے ہیں۔ اور بعض ہوائیاں و ماہتابیاں وغیرہ آتشبازی کی چیزوں کو فروخت کرکے گذارہ کرتے ہیں۔ مسافروں میں تین پنجابی موجود تھے۔ ایک لاہور کا۔ دوسرا وزیرآباد کا اور تیسرا ڈیرہ جات کا رہنے والا ہے۔ اُن کے قدوقامت کی درازی اور فربہی اور اس پر گذر اوقات کی یہ ذلیل صورت دیکھکر مجھے کمال تاسف ہُوا۔ دریافت کرنے پر اُنھوں نے بیان کیا۔ کہ ہم لوگ وطن سے تلاش روزگار میں کراچی آئے تھے۔ جب وہاں کوئی سبیل نظر نہ آئی تو بغداد شریف کا سفر مناسب معلوم ہوا۔ کہ بڑی متبرک جگہ ہے۔ کچھ دن وہاں کے تکیہ میں رہکر خیال ہوا کہ حج کریں۔ اس کے بعد بیت المقدس کی زیارت کا شوق غالب ہوا اور بیت المقدس سے آب و دانہ مصر میں کھینچ لایا۔ ان تمام سفروں میں منزل بمنزل کوچ ہوتا تھا۔ اور رات کبھی گاؤں اور کبھی شہر میں بسر کرتے تھے۔ روٹی بھی اِدھر اُدھر سے ملجاتی تھی۔ مگر اب جہاز کا کرایہ موجود نہیں۔ وطن کو واپس جائیں تو کس طرح؟

ہندی تکیہ کا موجودہ شیخ ہندوستانی نہیں۔ مگر اردو زبان بول لیتا ہے۔ پہلے ایک ہندوستانی سید علی شیخ التکیہ تھا۔ ان بنگالیوں نے اُس کے برخلاف شورش کرکے اُس کو موقوف کرایا اور ایک عرب کو یہ کہکر مقرر کرالیا کہ وہ ہندی الاصل ہے۔ شیخ التکیہ کو ہر سال ضروری مصارف محکمہ اوقاف سے ملتے ہیں۔ پہلے دن مسافروں کو روٹی بطور مہمان مفت ملتی ہے۔ کچھ قہوہ کا روزانہ خرچ بھی ملتا

رہتا ہے۔ مگر روٹی بھر نہیں ملتی۔ مسافر کو اختیار ہے کہ مزدوری وغیرہ سے جس طرح ہو سکے اپنا گذارہ کرے۔ لوگ بیان کرتے ہیں کہ کچھ عرصہ پیشتر ہندی تکیہ کی حالت بہت اچھی تھی۔ سید علی سے پیشتر جو شیخ التکیہ تھا۔ اس نے بہت سی جائداد فروخت کرکے خورد برد کرلی۔ اور اب ایک مکان کے سوا کوئی جگہ باقی نہیں۔ بالفعل تنگی مکان کے باعث ایک اور جگہ بھی کرایہ پر لے رکھی ہے۔

قلعہ اور چاہ یوسف قاہرہ کی جنوبی سمت سے ملی ہوئی ایک مشہور عمارت قلعہ کی ہے۔ جو کوہ مقطم کی چوٹی پر سطح شہر سے ۲۵۰ فٹ بلند تعمیر ہوئی ہے۔ یہ قلعہ مصر کے نہایت عجائبات میں سے ہے۔ اور سلطان صلاح الدین ایوبی کی عظمت کو یاد دلارہا ہے۔ جس نے چھٹی صدی ہجری کی صلیبی لڑائیوں میں عیسائیوں پر نمایاں فتوحات حاصل کی تھیں۔ قلعہ ایسے انداز سے بنایا گیا ہے کہ اس پر سے سارے شہر کی کیفیت نظر آتی ہے۔ اور باوجود اس قدر بلندی کے اندر جانے کا راستہ پہاڑ کاٹ کر اس طرح ہموار بنایا ہے کہ لدے ہوئے گھوڑے اور اونٹ آسانی سے چڑھ جاتے ہیں۔ قلعہ کے اندر محمد علی پاشا کا ایک عالیشان محل اور ایک نہایت خوشنما مسجد سنگ مرمر کی بنی ہوئی ہے۔ یہ وہی مسجد ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ آلاتِ حرب ڈھالنے اور بنانے کا ایک کارخانہ بھی اس جگہ موجود ہے۔

قلعہ کی عمارات میں سے چاہ یوسف ایک ایسی خصوصیت کی جگہ ہے کہ اس کے حالات قلم بند کئے بغیر قلعے کی سیر نامکمل رہ جاتی ہے۔ یہ کنواں تعمیر قلعہ کے زمانے میں پہاڑ کھود کر ۲۷۰ فٹ گہرا بنایا گیا تھا۔ اور دور چاہ کے

ساتھ ساتھ پہاڑ کاٹ کر چکر دار سیڑھیاں تیار کی ہیں۔ جو سطح آب کے برابر ایک طرف کو منتہی ہوتی ہیں۔ اس جگہ کچھ زمین مسطح ہے جس میں بیل رہٹ چلایا کرتے تھے جس سے پانی کنوئیں کی چوٹی پر چڑھ جاتا تھا۔ پھر ایک جگہ نلوں کی راہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ سیڑھیاں اس قدر چوڑی ہیں کہ بیل آسانی کے ساتھ اوپر سے نیچے آجاتے تھے۔ مصری اس کنوئیں کو "بیر حلزون" کہتے ہیں۔ حلزون کے معنے سنکھ کے ہیں جس کی شکل ان چکر دار سیڑھیوں کے مشابہ ہے۔

میں نے جب اس کنوئیں کو دیکھا تو اس سے بہت عرصے پہلے آبپاشی کا انتظام بند ہو چکا تھا۔ لیکن رہٹ کے آثار کا کچھ بقیہ معلوم ہوتا تھا۔ سیڑھیاں اگرچہ فراخ ہیں۔ مگر ان میں اندھیرا بہت ہے۔ وہاں کا چوکیدار ایک موم بتی جلا کر میرے ساتھ لے گیا تھا۔ اور میری بانہہ پکڑے ہوئے اس قدر تیزی سے چلتا تھا کہ مجھے تھکان معلوم ہونے لگی۔ اس سطح کے ایک طرف قبر کا تعویذ رکھا ہوا ہے جو یوسف نامی کسی شخص کا ہے۔ اس تعویذ کا کچھ پتہ نہیں ملا۔ کہ وہ شخص کس زمانہ میں تھا۔ اور اس کی قبر یہاں کیونکر بنائی گئی۔ یہاں کا چوکیدار اور تمام لوگ اس کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قبر سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر تاریخی واقعات اس بیان کے موید نہیں

دریائے نیل یہ دریا تمام ملک مصر کو جنوباً شمالاً سیراب کرتا ہے۔ اور بولاق و مصر العتیقہ کے نیچے سے بہتا ہوا بحیرۂ روم میں جا گرتا ہے۔ اس کا پانی نہایت میٹھا اور خوشگوار ہے۔ قاہرہ سے بارہ میل شمال کو جا کر اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ مشرقی شاخ فرع دمیاط کہلاتی ہے اور مغربی شاخ فرع رشید۔ اور اسکندریہ کے پاس سمندر میں داخل ہوتی ہے۔ ان دونوں شاخوں اور

سمندر کے ملنے سے زمین کا ایک ٹکڑا بشکل مثلث بن جاتا ہے۔ جو تین طرف پانی سے محدود رہتا ہے۔ اور اسے اصطلاح جغرافیہ میں ڈیلٹا کہتے ہیں۔ ہر شاخ میں بارہ مہینے پانی اس کثرت سے رہتا ہے کہ مسافروں کو گرما اور سرما میں کشتی کے بغیر عبور کرنا ناممکن ہوتا ہے۔

ملک مصر کی زرخیزی۔ سرسبزی اور شادابی کا اصل باعث اور مصریوں کی زندگی کے پُرلطف اور دلچسپ بنانے کا بڑا ذریعہ یہی دریا ہے۔ سال بسال موسم گرما میں جب اسکا پانی طغیانی پر آتا ہے تو مصری لوگ بڑی خوشیاں مناتے ہیں۔ اس دن ایک عظیم الشان میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں مسلمان۔ عیسائی۔ یہودی سبھی فرقوں کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ یہ طغیانی قدرت کے دلفریب نظاروں کا ایک کرشمہ ہے۔ ہر سال ایک وقت مقررہ پر اس کا شفاف اور ستھرا پانی گدلا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پانی کا یہ تغیر باشندگان مصر کو آئندہ آنے والی طغیانی کی خبر دیتا ہے۔ طغیانی آتی ہے۔ پانی بڑھتا ہے۔ اور گرد کی زمینیں سیراب ہو جاتی ہیں۔ پھر اپنے وقت مقررہ پر دریا گھٹ کر جہاں کا تہاں آجاتا ہے۔ اس اُتار چڑھاؤ میں لطف یہ ہے کہ جن دنوں اَور دریا طغیانی پر ہوتے ہیں نیل کمی پر ہوتا ہے۔ اور جن دنوں اَور ندیاں کمی پر ہوتی ہیں۔ نیل طغیانی پر ہوتا ہے۔ طغیانی کی اعلیٰ مقدار ساڑھے سات گز ہے۔ اس سے کمی و بیشی دونوں مضر ہیں۔ اس کمی بیشی کے جانچنے کے لئے دریا کے ساحل پر متعدد مقیاس الماء بنائے گئے ہیں۔ اور جب کبھی دریا میں غیرمعمولی زیادتی معلوم ہو تو قبل از وقت مصر کو غرقابی سے محفوظ رکھنے کی تدابیر سوچ لی جاتی ہیں۔ حالت طغیانی میں جہاں

جہاں یہ دریا جاتا ہے خیر و برکت اپنے ساتھ لیئے جاتا ہے۔ اور اپنی تہ کی چکنی مٹی کو بہا کر چاروں طرف پھیلا دیتا ہے۔ اس چکنی مٹی کو خدا نے کچھ ایسی تاثیر عطا کی ہے کہ جہاں جہاں یہ پہونچتی ہے زرخیزی اور سرسبزی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے اور جو زمین کسی وجہ سے محروم رہ جائے وہ ایسی خشک اور ناقابل زراعت ثابت ہوتی ہے۔ کہ بارش سے بھی اُس میں کچھ ایسی سرسبزی نہیں ہونے پاتی۔

قدیم مصری اس دریا کو عجیب و غریب آثار چڑھاؤ اور منفعت و مضرت کے لحاظ سے ایک دیوتا خیال کرتے تھے۔ اور ہر سال ایک نہایت خوبصورت کنواری لڑکی اسکی بھینٹ چڑھاتے تھے۔ تاکہ طغیانی حسب معمول آئے۔ اور ملک قحط اور ویرانی سے محفوظ رہے۔

دریائے نیل کی طغیانی کے متعلق تاریخ الخلفاء میں ایک عجیب واقعہ لکھا ہے کہ جب مصر فتح ہوا اور عمرو بن عاص وہاں آئے تو اتفاق سے اُس دن عجمیوں کا ایک تہوار تھا۔ لوگوں نے کہا حضور! ہمارے دریائے نیل کا ایک دستور ہے۔ کہ جب تک وہ پورا نہ کیا جائے دریا نہیں بہتا۔ اور وہ دستور یہ ہے کہ جب گیارہویں تاریخ ہوتی ہے تو ہم ایک کنواری لڑکی اس کے والدین کو رضامند کر کے لاتے ہیں اور اُسے عمدہ قسم کا لباس اور زیور پہنا کر دریا میں ڈالدیتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ اسلامی حکومت میں یہ نہ ہوگا۔ ناچار وہ خاموش ہوگئے۔ اور نیل بہنے سے بالکل رُک گیا۔ یہاں تک کہ لوگ ترک وطن پر آمادہ ہوئے عمرو نے یہ حال دیکھکر خلیفہ وقت حضرت عمرؓ کی خدمت میں عریضہ لکھا آپ نے

ان کی رائے کو پسند کیا۔ اور ساتھ ہی ایک پرچہ لکھکر بھیجا کہ اس کو دریا میں ڈالدیا جائے۔ پرچہ کا مضمون یہ تھا:-

اُردو ترجمہ	عربی عبارت
بسم اللہ الرحمن الرحیم	بسم اللہ الرحمن الرحیم
خدا کے بندے اور مسلمانوں کے امیر عمر کی طرف سے دریائے نیل کے نام۔ اگر تو اپنی مرضی سے بہتا ہے تو رُک جا۔ اور اگر خدا تجکو بہاتا ہے تو میں خدائے واحد سے درخواست کروں گا کہ تجھکو بہائے۔	من عبد اللہ عمر امیر المؤمنین الی نیل مصر۔ اما بعد۔ فان کُنتَ تجری من قبلك فلا تجرِ وان کان اللہُ یجریك فاسئل اللہ الواحد القہار ان یجریك۔ صفحہ ۱۲۶

یہ پرچہ آپ کے حکم سے دریا میں ڈالدیا گیا۔ اس سال دریا کی طغیانی اپنے پورے مقدار سے آئی۔ اور سنین مابعد میں حسب معمول طغیانی آتی رہی خلیفۂ اسلام کی دینی حمیت اور رائے صائب سے یہ وحشیانہ حرکت ہمیشہ کے واسطے زائل ہوگئی۔

دریائے نیل کو پہلے زمانہ میں اکثر لوگ آسمانی دریا سمجھتے تھے۔ چنانچہ شیخ ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامہ میں کسی حدیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نیلَ۔ فراتَ۔ جیحونَ۔ سیحونَ۔ یہ چاروں بہشت کی نہریں ہیں۔ لیکن حال کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ وسط افریقہ کی ایک جھیل وکٹوریہ نینزا اس کا منبع ہے۔ اور چند چھوٹے چھوٹے دریاؤں کے ملنے سے یہ عظیم الشان دریا بن گیا ہے۔

اس دریا کا طول ۶۶۰۰ میل ہے۔ یہ افریقہ کے سب دریاؤں سے بڑا اور ساری دنیا کے دریاؤں میں اس کا شمار دوسرے درجے پر ہے۔ سوڈان نیوبیہ اور مصر جیسے عظیم الشان ملک اس کے پانی سے سیراب ہوتے ہیں۔

کوبری دریائے نیل پر یوں تو کئی پل آمد و رفت کے واسطے بنے ہوئے ہیں۔ مگر قصر النیل کے قریب جو لکڑی کا ایک پل بنا ہوا ہے وہ بہت عجیب ہے۔ عرب اسکو "کوبری" کہتے ہیں۔ اور اس سے عبور کر کے جیزہ میں جاتے ہیں جہاں مصر کا عجائب خانہ ہے۔ پل کی چھت ایسے طریق سے بنائی گئی ہے کہ جب کل کے ذریعہ اس کو کھینچا جائے تو چھت اپنے مقام سے ہٹ کر کنارہ کے قریب آ جاتی ہے اور تجارتی جہاز جو اس انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہوتے ہیں۔ بڑی آسانی کے ساتھ ایک طرف سے دوسری طرف چلے جاتے ہیں۔ اس عرصہ میں پیدلوں کی آمد و رفت بند رہتی ہے۔ اور جب جہازوں کی درآمد برآمد ختم ہو جاتی ہے۔ تو پھر پل کی چھت کل کے ذریعہ سے اپنے موقع پر آ جاتی ہے۔ اور پیدل بدستور آمد و رفت کرنے لگتے ہیں۔ یہ اتفاق رات دن میں صرف ایک دفعہ ہوتا ہے۔ اور جو مسافر یہاں سے گذرتے ہیں۔ اُن سے کچھ کرایہ نہیں لیا جاتا۔

عجائب خانہ قاہرہ کے باہر ایک بہت بڑا عجائب خانہ ہے۔ جس کو یہاں کے لوگ انتیک خانہ کہتے ہیں۔ پرانی چیزیں فراہم کرنے کی تجویز ابتداءً محمد علی پاشا نے ۱۸۳۵ء میں کی تھی۔ اور ایک عمارت اس کے لئے خاص کر دی تھی۔ مگر اب یہ تمام اشیا اُس نئی عمارت میں منتقل کر دی گئی ہیں۔ جو اسمٰعیل پاشا خدیو مصر نے تعمیر کرائی تھی۔ یہ ایک نہایت عالیشان عمارت قاہرہ سے دو تین میل کے

فاصلے پر جیزہ میں واقع ہے۔ دریائے نیل کو پل کے ذریعے عبور کر کے وہاں جاتے ہیں۔ اسمیں بیشمار کمرے ہیں اور ہر کمرے میں زمانہ قدیم کے نوادرات علحدہ علحدہ نہایت سلیقے اور خوبصورتی سے مرتب کئے گئے ہیں۔ مصریوں کا خیال ہے کہ اکثر چیزیں حضرت عیسےٰؑ سے بھی بہت پہلے کی یہاں محفوظ ہیں جنہیں دیکھکر قدیم زمانہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔

سب سے زیادہ عجیب اور مصریوں کے کمالات ظاہر کرنے والی چیزیں آدمیوں کی لاشیں ہیں جن میں باوجود کئی ہزار برس گذر جانے کے ذرا بھی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ اور جنھیں انگریزی اور عرب حنوّط کہتے ہیں۔ اگلے زمانے کے مصریوں میں یہ طریقہ مروج تھا کہ جب ان کا کوئی آدمی مرجاتا تو اس کا پیٹ اور سر کا بھیجا صاف کر کے اُس پر ایک قسم کا مصالح لگا دیتے تھے۔ جس سے صدیوں تک مردہ کا جسم سڑنے سے محفوظ ہوجاتا تھا۔ میں نے ان لاشوں کو دیکھا۔ سر کے بال اور ہاتھوں کے ناخن اب تک اصلی حالت پر نظر آتے ہیں۔ البتہ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ گئی ہے۔ اور باقی سارا جسم جوں کا توں موجود ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ مصالح صرف مصریوں ہی کو معلوم تھا جس کو وہ اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے۔ اہل یورپ باوجود اس قدر علمی ترقی کے اس قسم کا کوئی مصالح آج تک ایجاد نہیں کر سکے۔ زیادہ تر حیرت کی بات یہ ہے۔ کہ موجودہ مصالح کی اصلیت دریافت کرنے سے بھی قاصر ہیں۔

اہرام قاہرہ سے آٹھ دس میل کے فاصلے پر ایک لق و دق میدان میں تیز مخروطی مینار بنے ہوئے ہیں۔ جن میں سے چیوپس والا مینار دنیا کے سات

عجائبات* میں شمار ہوتا ہے۔ اہل عرب ان میناروں کو اہرام کہتے ہیں۔
یہ اس قدر قدیم ہیں کہ اب تک ان کے تعمیر ہونے کی ٹھیک تاریخ کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ عرب اسی وجہ سے ان کو ہَرَم یعنے بڑھاپے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور اَہرام اسی لفظ ہرم کی جمع ہے۔

میں نے ایک دن اپنے معزز دوست فواد بک سلیم حجازی سے ان میناروں کی سیر کے متعلق خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ وہ ایک تاریخ مقرر کر کے مجھے لے گئے۔ پٹنہ کے ایک نوجوان سید علی کریم بیرسٹر بھی ہمارے ساتھ تھے۔ جب ہم لوگ چیوپس والے مینار کے قریب پہونچے تو ایک عرب نے جو مسافروں کو مینار دکھلانے میں مدد دیا کرتا ہے آگے بڑھکر اپنی خدمات بطور ترجمان پیش کرنی چاہیں۔ میں نے فواد بک سلیم کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ ہمارا ترجمان ہے۔ جس نے ترجمانی کے علاوہ گاڑی کا کرایہ اور راستہ کے جملہ مصارف اپنے ذمہ لے رکھے ہیں۔ اگر تمہیں انہی شرائط پر ترجمانی کرنی ہو۔ تو پھر کچھ عذر نہیں۔ عرب تو یہ فقرہ سنکر ٹھٹک گیا۔ مگر فواد بک کھل کھلا کر ہنس پڑے اور باوجودیکہ وہ اس جگہ کے سیر کے طریقوں سے بخوبی واقف تھے۔ پھر بھی انہوں نے عرب کو ساتھ رہنے دیا۔

اس مینار کی کرسی ایک مربع چبوترہ ہے۔ جس کا ہر ضلع ۷۶۴ فیٹ لمبا ہے۔ کرسی کے اوپر چاروں طرف تقریباً ساڑھے چار چار فیٹ

* نوٹ۔ سات عجائبات کی تفصیل یہ ہے (۱) مصر کے مینار (۲) مقبرہ شاہ ماسولیس (۳) سعید دیانا (۴) بابل کی دیواریں اور آویزان باغ (۵) بت روڈس (۶) بت جوپیٹر اولمپس (۷) برج سکندریہ۔

چبوترہ چھوڑ کر ایک اَور چبوترا بنایا گیا ہے۔ اور پھر اسی طرح دوسو تین چبوترے تلے اوپر بنتے چلے گئے ہیں۔ جن میں سے آخری یا سب سے اوپر کا چبوترہ اسقدر چھوٹا ہے کہ اس کے ہر ضلع کا طول تیس فٹ سے زیادہ نہیں۔ اور کل مینار کی بلندی ۴۵۰ فٹ تک پہونچ گئی ہے۔ ان چبوتروں کے نوبت بہ نوبت چھوٹے ہوتے جانے کو یوں سمجھنا چاہئے۔ جیسے ایک بہت اونچی بارہ دری ہو۔ اور اسکے اوپر چڑھنے کے واسطے چاروں طرف سیڑھیاں بنائی گئی ہوں۔ ان چبوتروں میں اس قدر لمبے لمبے پتھر لگے ہوئے ہیں کہ کسی کا طول تیس فٹ سے کم نہیں۔ مینار کے اندر ایک بہت بڑا تہ خانہ ہے جو دراصل چیوپس بادشاہ مصر کا مقبرہ ہے۔ جو اس کی زندگی میں بنایا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مینار چیوپس کے مقبرے ہی کے لئے تعمیر ہوا تھا۔ اور اُسی کے عہد کی یادگار ہے۔ راستے کی تنگی کے باعث اس تہ خانے میں ہر وقت اندھیرا رہتا ہے لیکن جو لوگ اندر جانا چاہتے ہیں۔ عرب لوگ مشعل کی روشنی سے اُنہیں اندر لے جاتے ہیں۔

مینار پر چڑھنے سے تمام ملک نہایت خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ دکھن کی طرف دریائے نیل بہتا ہے۔ اور اس میں کشتیاں چلتی ہوئی اور بادبان اُڑتے ہوئے عجب تماشا دکھلاتے ہیں۔ اور کنارے پر کا سبزہ عجب کیفیت سے لہلہاتا معلوم ہوتا ہے۔ اُتر کی طرف پہاڑوں اور ریگستان کی بھی ایک عجیب کیفیت ہے۔ پچھم کی جانب فیوم کا جنگل ہے۔۔۔۔ جو سرسبزی اور طرح طرح کے پھولوں کے سبب باغ کو بھی شرماتا ہے۔ پورب کیطرف

مقام جیزہ اور فسطاط کے بُرجوں اور قاہرہ کے میناروں اور صلاح الدین کے قلعے کا نظارہ عجب لطف دیتا ہے۔ اس مینار کی سیر کے واسطے یورپ کے بیسیوں مرد و عورت اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ جو لوگ چوٹی تک جانا چاہیں عرب اُنہیں سہارا دے کر اوپر تک لے جاتے ہیں۔ اور جو نہ جانا چاہیں وہ سیر کے طور پر عربوں کو کچھ دے کر اوپر چڑھنے کیواسطے کہدیتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے مشاق ہوتے ہیں کہ تھوڑی دیر میں بہت تیزی کے ساتھ چوٹی تک جا پہونچتے ہیں۔

مینار کے پتھر بہت کھُردرے اور سیاہ رنگ کے ہیں۔ بظاہر کوئی نفاست ان میں نظر نہیں آتی مگر ہندسی اصول کے لحاظ سے یہ عمارت تمام روئے زمین پر بے نظیر ہے۔ ان پتھروں کا طول و عرض دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ قدیم زمانے میں مصریوں نے فنّ انجنیری میں کس قدر ترقی کی ہوگی کہ اتنے بڑے بڑے پتھروں کو میناروں کی چوٹیوں تک پہونچا دیا جن کی مشکلات کو دیکھکر اِس زمانے کے لائق انجنیر حیران ہوتے ہیں۔ اور ان کو ماننا پڑتا ہے کہ علم جرثقیل کے موجودہ قواعد سے مصریوں کا علم بہت بڑھا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان عمارتوں کا بنانا انسانوں کا کام نہیں بلکہ جنات کا کام ہے۔ جو قوت اور قدرت میں انسانوں سے بڑھکر مانے گئے ہیں۔

مؤرخین نے لکھا ہے۔ کہ اس مینار کی عمارت بنانے میں ایک لاکھ آدمیوں کی مدد ہمیشہ لگی رہتی تھی۔ جو ہر سہ ماہی پر تبدیل ہو جاتی تھی۔ عرب اور ایتھوپیا سے پتھروں کے تراشنے اور ان کو مصر تک لانے میں پورے دس

برس لگے تھے۔ اور بیس برس میں یہ عمارت خاتمہ کو پہونچی تھی۔ جس کے اندر بے شمار کمرے اور بہت سے مکانات ہیں۔ اس مینار پر مصری حرفوں میں لکھا ہے کہ کاریگروں کے صرف لہسن اور پیاز کی چٹنی میں اڑھائی لاکھ روپے خرچ ہوئے ہیں اس پر قیاس ہو سکتا ہے کہ تمام عمارت کے بننے میں کس قدر لاگت لگی ہو گی۔ اس مینار سے تھوڑے فاصلے پر دو اور مینار ہیں۔ اور یہ پہلے مینار سے چھوٹے ہیں۔ اور ان سب میں بادشاہوں کی لاشیں رکھی ہوئی ہیں۔ ہم نے ان دونوں میناروں کو دور سے دیکھا تھا۔ کمی وقت کے باعث وہاں تک نہیں جا سکے۔

ابوالہول یہ ایک بت پتھر کا تراشا ہوا ہے۔ اور چیوپس والے مینار سے تقریباً چار سو گز کے فاصلے پر ہے۔ اسکی شکل عجیب و غریب ہے۔ نیچے کا دھڑ شیر کا اور سر عورت کا ہے۔ اگلی ٹانگیں پچاس فٹ لمبی اور سر کی چوڑائی ۱۴ فٹ ہے۔ چہرہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ابرو سے ٹھوڑی تک تیس فٹ کا فاصلہ ہے۔ اس بت کے قریب ایک زمین دوز بت خانہ کچھ مسقف اور کچھ غیر مسقف بنا ہوا ہے۔ اس کا دروازہ ہر وقت مقفل رہتا ہے۔ اور صرف سیاحوں کی درخواست پر کھولا جاتا ہے۔ اس میں سبز و سیاہ پتھر کی چٹانیں اس قدر لمبی لمبی لگی ہوئی ہیں جن کا طول سات گز سے کم نہ ہوگا۔ کہتے ہیں کہ اس جگہ قدیم زمانے میں بادشاہوں کی لاشوں کی پرستش ہوا کرتی تھی۔

اہرام اور ابوالھول کو مصر کی قدیم چیزوں میں اس قدر شہرت اور وقعت حاصل ہوئی ہے کہ ان دونوں کی تصویر گورنمنٹ مصر کے ڈاک کے ٹکٹوں پر بطور ملکی خصوصیت کے چھاپی جاتی ہے۔

ایک قدرتی نظارہ جو اہرام اور ابوالہول کے دریائے نیل کے قریب واقع ہونے سے حاصل ہے۔ وہ بہت پرلطف ہے۔ اور کسی عربی شاعر نے اس کا اچھا خاکہ کھینچا ہے۔

تامل ھیئت الھرمین وانظر | اہرام کی صورت دیکھو اور اس پر غور کرو۔
وبینھما ابوالھول عجیبٌ | اُن کے درمیان ابوالہول ایک عجیب چیز ہے
وماء النیل بینھما دموعٌ | دریائے نیل کی دھاریں آنسوؤں کی طرح بہ رہی ہیں،
وصوت الریح عندھم نحیبٌ | اور ہوا کی سنسناہٹ رونے پیٹنے کی آواز ہے
ددونھما المقطمُ وھو یحکی | ان دونوں سے اس طرف مقطم کی پہاڑی کہہ رہی ہے
رکابُ الرکب ابرکھا اللغوبُ | کہ شتر سوار و اونٹوں کو درماندگی نے تھکا کر بٹھا دیا ہے۔

ہم لوگ سیر سے فارغ ہو کر ایک ہوٹل میں آئے۔ جو صرف سیاحوں کے واسطے اس جگہ بنایا گیا ہے۔ مہتمم ہوٹل نے چار کے ساتھ مکھن۔ ڈبل روٹی اور ایک دو قسم کے مربے پیش کئے۔ یہاں ایک ہندو تاجر بھی ہمارا شریک ہو گیا۔ چار پیالیوں کی قیمت فی پیالی چھ پیاسٹر کے حساب سے ۱۲ ادا کی گئی۔ ان دنوں میں ٹریموے کی پٹری بھی شہر سے اہرام تک بچھ رہی تھی۔ یقین ہے کہ اس سے سیاحوں کو بہت آرام رہے گا۔ بالفعل عام لوگ گدھوں پر اور امرا گاڑیوں میں سوار ہو کر آتے ہیں۔ ہم جس گاڑی میں آئے تھے اس کا کرایہ ہمارے دوست فواد بک نے عہ روپیہ دیا تھا۔ نا خواندہ ترجمان عرب کو بھی پانچ پیاسٹر دئے۔ اور واپسی کے وقت اُس کو گاڑی میں بٹھا لائے۔

مصریوں کا تمدّن

اخلاق و عادات عام لوگوں کے مزاجوں میں عموماً اور اہل حرفہ کی طبیعتوں میں خصوصاً طمع۔ دروغگوئی اور خود غرضی از حد ہے۔ اُنکی بیشتر کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح بن پڑے روپیہ کمائیں۔ مسافروں کا مال ہضم کرنے اور اُن کو دہوکا دینے میں وہ ذرا تامل نہیں کرتے۔ اور جب لین دین میں دیسی اور پردیسیوں میں باہم جھگڑا ہوتا ہے تو ہمیشہ دیسی کی تائید اور پردیسی کی مخالفت کرتے ہیں۔

عامۃ الناس کی یہ دنائت اخلاق اور کمینہ خصلتیں دیکھکر مجھے خیال ہوا تھا کہ خدیوی سلطنت کے تغیرات اور علم و فضل کی کمی اس بداخلاقی کا باعث ہوئی ہے۔ لیکن شیخ ابن بطوطہ کا سفرنامہ پڑہنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں بھی شہر قاہرہ ایسے دنی الطبع اشخاص سے خالی نہ تھا۔ شیخ موصوف لکھتا ہے کہ " اس شہر میں علما۔ فضلا۔ شریف و وضیع و عامی ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔ اچھے۔ برے۔ ثقہ۔ رند۔ عقلمند و بیوقوف۔ مسخرے اور متین۔ مکار و راستباز۔ جس قسم کے آدمی چاہو یہاں بکثرت نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں کی اس قدر کثرت دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا مخلوقات کا ایک بن ہے۔

متوسطین کی طبائع میں یوں تو ظاہرداری بہت ہے۔ اور بات بات میں خوش کن الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مگر کچھ سردمہری اور بے مروتی کی بو

ان میں بھی پائی جاتی ہے۔

امرا اور تعلیم یافتہ لوگوں کے اخلاق بہت اچھے ہیں۔ گفتگو میں شائستگی بڑوں کا لحاظ وادب۔ چھوٹوں پر مہربانی وشفقت۔ عیب جوئی سے پرہیز نکتہ چینی سے نفرت ان کے مزاجوں کا خاصہ ہے۔ خاص خوبی ان میں یہ ہے کہ قومی معاملات میں مدد کرتے ہیں۔ چنانچہ مصنفیں کی محنت کی داد دینے اور اُنکی حوصلہ افزائی کرنیکے خیال سے اُن کی تصانیف کی کچھ جلدیں خرید کر لوگوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں لائق اخبار نویسوں کی امداد کو ضروری سمجھتے ہیں۔ باہمت آدمیوں کو روپیہ دیکر اُن کا کام جاری کرا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی غریب لوگوں کی کم قیمت چیزیں زیادہ قیمت پر بھی خرید لیتے ہیں۔

مکانات غربا کے مکان اکثر تنگ وتاریک ہوتے ہیں۔ ان میں زنانے ومردانے مکانوں کی علیحدگی کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ لیکن متوسط الحال اور ذی مقدور اشخاص کے ہاں زنانے اور مردانے مکان الگ الگ ہوتے ہیں۔ دولتمندوں کے مکان بہت خوشنما ہیں اور اُن میں ہر قسم کی صناعی وگلکاری اور رنگین شیشوں کے کام کی آرائش خوب ہوتی ہے۔ دروازے شاندار اور اُن میں خوبصورت پردے آویزاں۔ صحن میں اکثر ایک حوض اُسکے گرد کھجور کے درخت۔ خوابگاہ۔ نشست وبرخاست۔ خورد ونوش اور مطالعہ کے واسطے علیحدہ علیحدہ کمرے جن میں سے خوابگاہ کے کمرے پُر تکلف ہوتے ہیں۔ اور اُن میں نہایت خوشنما چھتر یدار آہنی مسہریاں بھی رہتی ہیں۔ جو تیس چالیس روپیہ سے لے کر دو سو روپیہ تک کی قیمت کی ہوتی ہیں۔

یہاں کے تمام مکانوں میں بلالحاظ امیر و غریب کے ایک خصوصیت یہ ہے کہ دروازے ہمیشہ بند رہتے ہیں۔ اندر کی جانب ایک کھٹکہ ہوتا ہے جو دروازہ بند کرنے کے وقت خود بخود لگ جاتا ہے۔ مگر اس کھٹکے میں ایک رسّی بندھی ہوتی ہے جس کا دوسرا سرا نشست کے مقام پر کسی میخ میں اٹکا رہتا ہے۔ جب کوئی باہر سے دستک دیتا ہے تو صاحب مکان یا اُسکے نوکر کو دروازے تک جانا نہیں پڑتا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے رسّی کو کھینچتا ہے اور کھٹکے کے اُٹھنے سے دروازہ کھل جاتا ہے۔ اس رسّی کا آرام اُس وقت زیادہ معلوم ہوتا ہے جبکہ قیام اوپر کی منزل میں ہو۔

یہاں کے لوگ فرش پر بیٹھنے کے کم عادی ہیں۔ دیوار سے لگی ہوئی لکڑی کی ایک لمبی بنچ جو بینت کی بنی ہوئی ہوتی ہے بچھی رہتی ہے۔ اُس پر روئی کا گدا بچھا ہوا ہوتا ہے جس کو مصری "دِکّہ" کہتے ہیں۔ جو لوگ ملاقات کو آتے ہیں اُس پر بے تکلف بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ نشست کا قدیم طریق ہے۔ اور ابتک رائج ہے۔ مشائخ علماء اور پرانے فیشن کے لوگ اسی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ مگر یورپ کے میل ملاپ سے اب میز کرسی کا رواج نئے تعلیم یافتہ اور امرا میں عام ہوتا جاتا ہے۔ فرش اگرچہ کیسا ہی قیمتی ہو۔ مگر بوٹ پہنے اُس پر چلنے پھرنے کا عام دستور ہے۔ البتہ بوٹوں کی کیچڑ اور غلاظت دور کرنیکے واسطے کمرہ کے باہر نصف قوس کی شکل کا آہنی حلقہ دونوں سروں کی طرف سے تھوڑا تھوڑا زمین میں گڑا رہتا ہے جسکا اوپر کی طرف دھار نکلی ہوئی ہوتی ہے۔ جب کوئی شخص باہر سے آتا ہے تو بوٹ کے تلے اُس دھار پر رگڑ کر صاف کر لیتا ہے۔

کھانے پینے کا طریق کھانا کھانے کا طریق اس ملک میں مدت دراز سے یہی چلا آتا ہے۔ کہ ایک گول میز بیچ میں بچھائی جاتی ہے اور اُسکے گرد کرسیاں۔ کھانے کی متعدد قابیں اور کچھ خمیری روٹیاں ایک خوان میں لگ کر آتی ہیں۔ کسی قاب میں خالی شوربا ہوتا ہے۔ کسی میں سادہ گوشت۔ کسی میں ترکاری کا سالن۔ کسی میں کباب۔ کسی میں شیرینی۔ اور سب سے آخری قاب میں پلاؤ ہوتا ہے۔ ایک ایک قاب باری باری سے میز پر رکھی جاتی ہے۔ اور سب اُسی پر ملکر ہاتھ سے کھاتے ہیں۔ کھانے سے پیشتر ایک ایک رومال بھی ہر ایک کھانے والے کے آگے رکھدیا جاتا ہے۔ اور وہ اسکو اپنے گھٹنوں پر ڈال لیتا ہے کہ کھانا کپڑوں پر نہ گرے اور دھبہ نہ لگے۔ امرائیں یوروپین فیشن کے مطابق ہر ایک کے آگے علیحدہ علیحدہ برتنوں میں کھانا رکھا جاتا ہے۔ اور نوبت بنوبت رکابیاں بدلتے رہتے ہیں۔ چھری کانٹے اور چمچے کا استعمال بھی ہوتا ہے۔

مصری کھانوں میں سب سے عمدہ اور لذیذ کھانا بُھنا ہوا گوشت ہوتا ہے۔ یہ لوگ بھیڑ یا دُنبے کی ایک پوری ران کو گھی میں اس طرح بھونتے ہیں کہ اُس کا رنگ سُرخ اور گوشت گداز ہو جاتا ہے۔ پلاؤ نیم پخت اور صرف مصریوں کے مذاق کے موافق۔ روٹی تنور کی خمیری عموماً دو تین دن کی باسی جو اس ملک کی آب وہوا کے لحاظ سے زود ہضم سمجھی جاتی ہے۔ سرکہ کے اچار کا اس ملک میں بہت رواج ہے۔ اسکو "ترشی" اور "مخلل" کہتے ہیں۔ عامۃ الناس کا زیادہ گذر اوقات اِسی پر ہے۔

مردانہ لباس

مصر کے علما سوداگر۔ اور پُرانے فیشن کے بزرگوار اب تک ملکی لباس پہنتے ہیں۔ سر پر ترکی ٹوپی جس کے گرد ایک سفید کپڑا خاص طریق سے لپیٹا ہوا ہوتا ہے۔ گلے میں نیچے اوپر دو لمبی عبائیں جنکے دامن ٹخنوں تک پہونچتے ہیں۔ عبا کی آستینیں مقدار مقررہ سے ایک بالشت لمبی اور سلائی نہ ہونے کے باعث کھلی رہتی ہیں۔ یہ عبا عموماً دھاریدار ریشمی کپڑے یا سیاہ الپاکے کی ہوتی ہیں۔ لٹھے کا پاجامہ اور پاؤں میں دیسی جوتی ہوتی ہے۔ لیکن نئی پود کو یورپین لباس اور یورپین وضع بہت مرغوب ہے۔ جس نوجوان کو دیکھو انگلش کوٹ اور پتلون سے آراستہ ہے۔ گلے میں کالر اور نکٹائی۔ پاؤں میں بوٹ اور ہاتھ میں چھڑی موجود ہے۔ یہاں کے لوگ اس لباس پہننے کو ”آلا فرنکا“ یعنے فرنگی وضع کہتے ہیں۔ جو چیز یورپین اور مسلمانوں میں فی الجملہ باعث تفریق ہوسکتی ہے وہ صرف ترکی ٹوپی ہے۔ اور ڈاڑھی منڈوانے کے لحاظ سے تو دونوں فریق برابر ہیں۔ علما اور پُرانے فیشن کے بزرگوار اگرچہ نہیں منڈواتے۔ مگر ان میں بھی اکثر خشخاشی رکھتے ہیں۔

یہ نیا لباس صرف مسلمانوں تک محدود نہیں۔ بلکہ وہاں کے عیسائی اور مسلمان دونوں یکساں طور پر اسی لباس میں نظر آتے ہیں۔ اس پر رنگت اور زبان کا اتحاد ایسا واقع ہوا ہے۔ کہ ناواقف آدمی دونوں قوموں میں کچھ تمیز نہیں کرسکتا۔ زیادہ تر عجیب یہ معاملہ ہے کہ عیسائیوں کے نام بھی مسلمانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ ایک نوجوان نجیب نام کے ساتھ مہینہ بھر تک میری ایک قہوہ خانہ میں نشست و برخاست رہی۔ مگر کبھی گمان نہ ہوا کہ یہ عیسائی ہے۔

اتفاقاً ایک شخص نے کسی موقعہ پر اس کے مذہب کا ذکر کیا۔ تو اصل حقیقت کھلی۔ البتہ یہودی لوگ آسانی سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُنکی لمبی ڈاڑھی اور لمبی قبا اُنکی قومی تمیز کے واسطے کافی علامت ہے۔

عام لوگوں کا لباس یہ ہے۔ کہ ترکی ٹوپی کے اوپر ایک چھوٹا سا سفید لفّہ لپیٹ لیتے ہیں۔ اور ایک نیلا کُرتہ پہنتے ہیں جو ٹخنوں تک لمبا ہوتا ہے، اس کُرتے کے نیچے اکثر ایک پاجامہ بھی ہوتا ہے۔

زنانہ لباس عورتوں کا لباس اس ملک کے قدیمی رسم و رواج کو ظاہر کرتا ہے اُنکی پیشانی پر ایک سیاہ پٹی بندھی ہوتی ہے۔ گلے میں سیاہ رنگ کا ایک لمبا کُرتہ ہوتا ہے جو ٹخنوں تک پہونچتا ہے اور کُرتہ کے اوپر ایک ڈھیلا ڈھالا کپڑا ہوتا ہے جو تمام بدن کو ڈھانپے رہتا ہے۔ چہرے پر ایک نقاب پڑی رہتی ہے جو پردہ کے لحاظ سے برقع کا کام دیتی ہے۔ یہ نقاب ایک سیاہ کپڑے کی لمبی دھجی سی ہوتی ہے جو غریبوں میں پیتل اور امیروں میں سونے کی ایک ریل کے ذریعہ سے پیشانی پر لٹکائی جاتی اور لمبان میں ناف تک لٹکتی رہتی ہے۔ اور جب ضرورت پیش آتی ہے تو نقاب اُٹھا کر سر پر ڈال لیتی ہیں۔ غالباً یہی نقاب ہے جس کی مشابہت آنریبل سر سید احمد خان مرحوم مغفور نے اپنی کسی تحریر میں ہاتھی کی سونڈ سے دی تھی۔ شرعی پردہ کے لحاظ سے یہ نقاب گو عمدہ ہے مگر ریل جو نقاب لٹکانے کے واسطے ماتھے پر رکھی جاتی ہے۔ فی الجملہ کریہ معلوم ہوتی ہے۔ ترکی عورتوں میں سفید نقاب کا رواج ہوتا جاتا ہے۔ جس میں سے اوپر کا نصف چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ نقاب سیاہ دھجی اور پیتل یا سونے کی ریل کے مقابلے میں بہت خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ زنانی

نئی پود میں بھی انگریزی لباس مروج ہوتا جاتا ہے۔ اور دن بدن ترقی پر آیا ہے۔

پردہ مصری عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ مگر کاروبار کے انصرام کے واسطے گھر کے باہر آتی جاتی ہیں۔ سودا سلف خریدنے کے واسطے بازاروں میں پھرتی ہیں۔ دوکانداروں سے بے تکلف بات چیت کرتی ہیں۔ دوکانوں کے اندر کرسیوں پر بیٹھکر چیزیں پسند کرتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چوڑیاں چڑھانا پاؤں میں بوٹ پہنانا یہ سب دوکانداروں کے نوکروں کا کام ہے۔ دوکاندار یا اُس کے کارندے پر یہ بھی لازم ہے کہ جب کوئی عورت سودا لینے کو آئے تو بہت خندہ پیشانی کے ساتھ اُس سے بات چیت کرے۔ جو دوکاندار اِسکے خلاف عمل کرتے ہیں عورتیں اس کو متکبر سمجھکر دوسری دوکان پر چلی جاتی ہیں مجالس مولود۔ مساجد اور سیر گاہوں میں اکثر عورتیں جاتی ہیں۔ اُمرا اور ذی مقدور لوگوں کی عورتیں گاڑیوں میں بیٹھکر نکلتی ہیں۔ اِن گاڑیوں کی دونوں طرف کی جھلملیاں کھُلی ہوتی ہیں۔ خواجہ سرا کوچوان (کوچبین) کے برابر بیٹھتا ہے۔ اور خاتون کے اُترنے چڑھنے کے وقت گاڑی کا دروازہ کھولتا اور بند کرتا ہے۔

بیاہ شادی کا طریق منگنی اور بیاہ کے جو طریقے اس ملک میں مروج ہیں اُن میں اور ہندوستانی رسم و رواج میں بہت کچھ تفاوت ہے۔ مصریوں کا یہ عام اصول ہے کہ جب تک لڑکا جوان اور روٹی کمانے کے لائق نہ ہو جائے اُسکی شادی نہیں کرتے۔ منگنی کے ابتدائی مراتب کو لڑکے کی ماں خود طے کرتی ہے۔ اور چند قریبی رشتہ دار عورتوں کو ہمراہ لے کر لڑکی کے گھر جاتی ہے

لڑکی کی شکل وصورت دیکھنے اور سلیقہ کا اطمینان کرنے کے بعد شادی کی خواست کی جاتی ہے۔ بیٹے کے خاندانی اوصاف اور ذاتی قابلیتیں بیان کی جاتی ہیں۔ خاتمہ پر یہ بھی کہنا ہوتا ہے کہ لڑکا ٹوپی پہنتا ہے یا لفہ باندھتا ہے۔ ٹوپی اور لفہ کا تذکرہ اگر سہواً یا عمداً نہ ہوا ہو تو لڑکی کی ماں خود اس کی تشریح کرا لیتی ہے۔

میرے ایک مصری اُستاد نے جو ملک کے رسم و رواج کی نسبت ہر ہفتے میرے روبرو ایک تقریر کیا کرتا تھا۔ اس سوال کی یہ وجہ بتائی کہ آجکل کے تعلیم یافتہ سب ٹوپی پہنتے ہیں۔ اور یہی لوگ دولت و عزت میں ترقی کر رہے ہیں۔ پرانے فیشن کے لوگ علی العموم لفہ باندھتے ہیں۔ اور رفتار زمانہ کے لحاظ سے پرانی تعلیم کے ساتھ اُنکی حالت بھی رُو بتنزل ہے۔ ٹوپی اور لفہ کے سوال سے درحقیقت نئی اور پرانی روشنی میں امتیاز کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور ٹوپی پہننے والے کو لفہ پوش پر ترجیح دیجاتی ہے۔

اس گفتگو کے بعد اگر فریقین باہم متفق ہو جائیں تو جو عورتیں باہر سے آئی تھیں خوشی کے نغمے گاتی ہوئی نکلتی ہیں۔ جن کو "زعوط" کہتے ہیں اس زعوط سے محلے والوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ شادی قرار پا گئی۔ اور اگر لڑکی کی ماں کو شادی کرنے میں عذر ہوتا ہے تو وہ کہدیتی ہے کہ مردوں سے مشورہ کرنے کے بعد جواب دیا جائے گا۔ اور اس حالت میں یہ عورتیں جیسے چپ چاپ آئی تھیں ویسے ہی خاموش واپس چلی جاتی ہیں۔

منگنی کی بات چیت جب عورتوں میں ہو جائے۔ تو پھر یہ سوال مردوں کے روبرو حرف پختگی کی غرض سے پیش ہوتا ہے۔ اس وقت سب سے اہم معاملہ

تعیین مہر کا سمجھا جاتا ہے۔ مہر جو کچھ قرار پا جائے اُس کا نصف لڑکی کے باپ کے حوالہ ضرور کر دینا پڑتا ہے۔ اور یہ رقم مقدار میں اس قدر ہوتی ہے کہ جس کا نصف آسانی سے پیشگی ادا ہو سکے۔ لڑکی کے والدین اِس زرِ مہر میں سے عروس کے لئے کپڑے اور زیور کی ایک دو رقموں کے علاوہ مفصلہ ذیل چیزیں خریدتے ہیں۔ ایک آہنی مسہری مع پردہ و بستر جو تیس چالیس روپے سے لے کر دو سو روپے تک کی مالیت کی ہوتی ہے۔ ایک آئینہ قدِ آدم لمبا۔ ایک میز۔ دو تین کرسیاں۔ ایک دِکّہ (بنچ مفروش) ایک دری۔ ایک قالین کھانے پکانے کے مسی برتن۔ والدین بھی اپنی حیثیت کے موافق کچھ روپے اپنی طرف سے اس میں شامل کر دیتے ہیں۔ زیادہ زیور بنانے کا رواج یہاں نہیں ہے۔ اگر نکاح منگنی کے وقت قرار پا جائے تو عروس باوجودیکہ میکے میں ہے مگر نان ونفقہ اُسی دن سے دولہا کے ذمہ واجب ہو جاتا ہے۔

شادی کے دن دولہا اپنے والدین اور رشتہ داروں اور دوستوں کے ہمراہ شام کے وقت دُلہن کے گھر جاتا ہے۔ آگے آگے باجا ہوتا ہے پیچھے چند نوجوان براتیوں کے ہاتھ میں ایک ایک کاغذی فانوس موم بتی سے روشن جو برات کے واسطے روشنی کا کام دیتا ہے۔ براتی اور دولہا شب کا کھانا کھا کر اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ دوسرے دن دُلہن کے والدین عروس کو بگھی میں سوار کر کے دولہا کے گھر بھیج دیتے ہیں۔ اور جہیز کا سامان بھی ساتھ کر دیتے ہیں۔ اسی کو عربی میں زفاف کہتے ہیں۔ اگر نکاح منگنی کے دن نہ ہوا ہو تو اب دولہا کے گھر میں پڑھایا جاتا ہے۔

سب سے عجیب بات جو اس وقت عمل میں آتی ہے وہ یہ ہے۔ کہ دلہن کی بکارت کا امتحان دولہا کے ہاتھ سے عورتوں کے مجمع میں کیا جاتا ہے۔ اس مجمع میں میکے اور سسرال دونوں طرف کی عورتیں موجود ہوتی ہیں۔ اگر دولہا کی تہذیب مانع امتحان ہو۔ تو پھر یہ خدمت دائی کے ذریعہ تکمیل کو پہونچتی ہے۔ مدعا اس امتحان کا یہ ہے کہ عورتیں قبل از شادی زنا سے محفوظ رہیں۔

عامۃ الناس بلالحاظ جنسیت (قومیت) اکثر مالدار آدمی سے عورت کی شادی کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کے بعض لوگ جو بطریق تجارت اور طبابت اس ملک میں آمد و رفت کرتے ہیں۔ مصری عورتوں سے شادی کر لیتے ہیں۔ ایک ہندوستانی راوی سے ایک مصری نے کہا کہ تم شادی کر لو۔ اُس نے کہا میری شادی وطن میں ہو چکی ہے۔ مصری نے کہا جب تک یہاں رہو بیوی کو آباد رکھو۔ جاتے ہوئے طلاق دیدینا۔ یہاں کی عورتیں محب الوطن ہوتی ہیں۔ غیر ملک میں جانا پسند نہیں کرتیں۔

بیوی کے اختیارات شادی کے بعد امور خانہ داری کا انصرام بیوی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ میاں کو لازم ہے کہ جو کچھ کمائے بیوی کے آگے لاکر رکھدے اور اُس کا اختیار ہے کہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ میاں کے جیب خرچ کے واسطے البتہ ایک رقم اُسے دینی پڑتی ہے۔ با ایں ہمہ بیوی کا میلان خاطر میاں کی نسبت اپنے والدین کی طرف زیادہ ہوتا ہے۔ جائز و ناجائز جو موقع اسکو ملتا ہے والدین کے گھر چیزیں بھجواتی رہتی ہے جب کبھی میاں نے اس

معاملہ میں کچھ تشدد کیا تو بیوی جہیز کا سارا سامان اٹھوا کر میکے میں چلدیتی ہے۔ اگر اس عرصے میں باہم مصالحت ہوگئی تو خیر ورنہ بیوی قاضی خانہ میں پہونچکر طلاق کی درخواست پیش کرتی ہے۔

طلاق کی رسم مصریوں میں کچھ معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ اور نہ کسی مرد کو طلاق شدہ عورت سے نکاح کرنے میں کچھ تامل ہوتا ہے۔ بہت تھوڑے اشخاص ہوں گے۔ جن کو ایک ہی عورت سے زندگی بسر کرنے کا موقع ملا ہو۔ اور کثرت سے ایسی عورتیں ہونگی جنہیں ایک سے زیادہ مرتبہ نکاح کا اتفاق ہوا ہو۔ البتہ امراو معززین میں طلاق دینے کا دستور کم ہے۔

خوشی کے جلسے مصری لوگ بڑے عیش پسند اور سرور و طرب کے پسند ہیں۔ عقیقہ۔ ختنہ۔ بیاہ۔ غسل صحت وغیرہ تقریبوں میں بڑے زور شور سے فرحت اور شادمانی کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔ وسط مجلس میں لکڑی کا ایک چبوترہ بنایا جاتا ہے اور اسکے چاروں طرف لکڑیوں یا بانسوں کے ڈنڈے کوئی ایک ایک گز کے لمبے گاڑ دیتے ہیں۔ تاکہ چبوترہ عام لوگوں کی آمد و رفت سے محفوظ رہے۔ چبوترہ اور ڈنڈے سرخ ململ سے منڈھے جاتے ہیں یہ چبوترہ خاص گویوں کے واسطے ہوتا ہے۔ جو جملہ آلات سرود لے کر اس پر بیٹھتے ہیں۔ اور عربی زبان میں اس خوش آوازی سے گاتے ہیں کہ سننے والونکو وجد ہو جاتا ہے۔ چبوترہ کے چاروں طرف حاضرین جلسہ کے واسطے کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔

ان تقریبوں میں فرش۔ دِگے۔ کرسیاں۔ جھاڑ۔ فانوس وغیرہ جو سامان

آرائش مطلوب ہوتا ہے۔ وہ عموماً ٹھیکہداروں کے پاس موجود رہتا ہے۔
ٹھیکہداروں کے ملازم اپنی تجویز سے مکان سجا جاتے ہیں۔ روشنی کا انتظام
کر دیتے ہیں۔ مکان کے دروازے اور متصلہ گلی میں بند رواریں تان کر سُرخ و
سبز وغیرہ رنگوں کی بیرقیں لٹکا دیتے ہیں۔ اور ان تمام چیزوں کی نگرانی رکھتے
ہیں۔ اور جلسہ ختم ہونے کے بعد سارا سامان اپنی ذمہ داری سے اُٹھوا کر
لے جاتے ہیں۔ صاحب مجلس ان چیزوں کا مقررہ کرایہ اور نوکروں کی اُجرت
ادا کر دیتا ہے۔ یہ ایسی تجویز ہے جس سے امیر سے لے کر غریب تک ہر شخص
کو جلسے کرنے میں بہت آسانی ہوتی ہے۔

مجلس مولود یہاں کے مسلمانوں میں ایک عام دستور ہے کہ ہر سال رسول
کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت کی یادگار میں مجالس منعقد کرتے
ہیں۔ اور نہایت خوشی و خورمی سے اس کار خیر کے لوازم بہم پہونچاتے
ہیں۔ یکم ربیع الاول سے حسب معمول کثیر التعداد خیمے عباسیہ کے میدان میں نصب
کئے جاتے ہیں۔ ارکان دولت۔ مفتی بلاد مصر۔ شیخ الازہر۔ قاضیوں اور علما کے
خیمے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ خدیو معظم کا بھی ایک عالی شان خیمہ ہوتا ہے۔
اور اُن کی طرف سے ایک نائب موجود رہتا ہے۔ یہ خیمے ہر قسم کے فروش نفیسہ
اور شیشہ و آلات سے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ ان کی قطار بیضاوی شکل کی
ہوتی ہے۔ اور بیچ میں ایک وسیع میدان خالی رکھا جاتا ہے۔ چاروں طرف
جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں۔ جنکے پھریرے رنگین اور خوشنما ہوتے ہیں۔ ہر خیمہ میں
شربت یا چاء یا اسی قسم کی کوئی چیز ہر وقت موجود رہتی ہے۔ جس وقت کوئی

شخص آئے اس سے اسکی تواضع کی جاتی ہے۔

پہلی تاریخ سے لوگوں کی آمد شروع ہوتی ہے۔ اور روز بروز مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ علما اور خوش بیان قاری ہر روز شام کو مولود پڑھتے ہیں اور حاضرین اس سے دلی حظ حاصل کرتے ہیں۔ آخری دن کا جلسہ بڑا عظیم الشان ہوتا ہے۔ ایک جید عالم جناب سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ولادت باسعادت کے حالات نہایت فصاحت و بلاغت سے پڑھتا ہے اسوقت حسب معمول سب لوگ کھڑے ہوجاتے ہیں اور دیر تک نہایت مسرت اور دلی توجہ سے سنتے ہیں۔ خاتمۂ ذکر پر مولود ختم ہوتا ہے اور مجلس برخاست ہوجاتی ہے۔

مولودخوانی کے خیموں کے احاطے کے باہر سڑک کے کنارہ پر دوکانیں لگ جاتی ہیں۔ اور نہایت خوبی سے آراستہ ہوتی ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں اور فروخت کا سامان ان میں موجود رہتا ہے۔ ایک طرف ہنڈولے موجود رہتے ہیں۔ نصارٰی تصویریں بھی فروخت کرتے ہیں۔ مصر میں آزادی اس قدر ترقی کرگئی ہے کہ ایسی متبرک مجالس کے موقعے پر بھی شاہدان بازاری اپنے خیمے لگاتے ہیں اور محفل رقص و سرود گرم رکھتے ہیں۔ اور شائقین ٹکٹ لیکر شریک محفل ہوتے ہیں۔ شراب کی دوکانیں بھی ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ خیموں کا بیرونی اجتماع بادی النظر میں میلوں کے مشابہ معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ امر گورنمنٹ مصر کی توجہ کا محتاج ہے کہ ایسے دینی جلسے کو اس بدعت سے بالکل پاک صاف کرے۔

مصریوں کو ایسی یادگاروں کے قائم رکھنے میں ایک خاص دلچسپی ہے چنانچہ مولد نبوی کے علاوہ ائمۂ دین اور فرمانروائے وقت کی ولادت کے متعلق بھی

جلسے منعقد کرتے ہیں۔ خصوصاً سلطان المعظم اور خدیو مصر کی عید المیلاد پر تو انکی طرف سے بڑے تزک و احتشام کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے جس سے اسلامی شوکت اور مسلمانوں کی اجتماعی قوت پر بڑا اثر پیدا ہوتا ہے۔

قہوہ خانہ کی نشست مصریوں کو زندگی بسر کرنے اور دوستوں سے میل ملاقات کے واسطے قہوہ خانہ سب سے عمدہ جگہ ہے۔ یہ قہوہ خانے اکثر کشادہ مکانات میں ہوادار موقعوں پر ہوتے ہیں۔ لوگ فرصت کے وقت صبح و شام یہاں آکر بیٹھتے ہیں۔ نشست کے واسطے عمدہ قسم کی کرسیاں اور چھوٹی چھوٹی خوبصورت میزیں بچھی رہتی ہیں۔ تاکہ دو دو تین تین دوست ملکر بے تکلف بیٹھ سکیں۔ چاء۔ قہوہ اور حقہ نوشی کا پورا انتظام ہوتا ہے۔ تین چار تازے اخبار۔ ایک دو بساط شطرنج بھی موجود رہتے ہیں۔ ان کے سوا سگریٹ۔ میوہ جات کباب اور اَور کھانے پینے کی چیزیں ملازمان قہوہ خانہ کے ذریعے سے مہیّا ہو سکتی ہیں۔

حقے کانچ کے ہوتے ہیں۔ جن پر پیچوان لگے ہوئے۔ پیچوانوں کے سر پر ریشمی پھول بہت خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ چلم بہت چھوٹی سی۔ اور سوکھا تمباکو پانی میں ڈبو کر نچوڑ لیتے ہیں۔ اور اس پر دو دہکتے ہوئے کوئلے رکھدیتے ہیں۔ ہر شخص کے پاس علیحدہ علیحدہ حقہ ہوتا ہے۔ چونکہ حقہ کانچ کا ہوتا ہے اس واسطے مصری اُس کو "شیشہ" کہتے ہیں۔ اور بعض نرگیلا اور ارگیلا بھی کہتے ہیں۔

لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ صبح سے آدھی رات تک جاری رہتا ہے

کوئی چا پیتا ہے۔ اور تکان دور کر کے چلا جاتا ہے۔ کوئی اخبار بینی میں مشغول ہے۔ کوئی اپنے رفیق کے ساتھ شطرنج کھیل رہا ہے۔ ملکی۔ اخلاقی۔ تاریخی۔ اور ادبی مضامین کے متعلق بھی گفتگو رہتی ہے۔ ادائے مصارف کا یہ دستور ہے کہ ایک دوست کی موجودگی میں جتنے احباب آئیں۔ ان سب کے مصارف وہی ادا کرتا ہے۔ جو پہلے سے قہوہ خانہ میں بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہ طریقہ باہمی ربط و ضبط پیدا کرنے کا بہت عمدہ ذریعہ ہے۔ غرض دوستوں کی ملاقات اور باہمی تبادلۂ خیالات کے لئے اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ پھیری والے سوداگر جرابیں۔ رومال۔ صابون۔ چاقو۔ قینچی۔ چھڑی وغیرہ چیزیں لئے ہوئے چکر لگاتے رہتے ہیں۔ بعض لوگ اِدھر اُدھر سے کتابیں بھی فروخت کے لئے لے آتے ہیں۔ اور اس طرح ان قہوہ خانوں میں صبح سے شام تک چہل پہل رہتی ہے۔ کچھ مدت پیشتر شرفا قہوہ خانوں میں جانا معیوب سمجھتے تھے۔ مگر اب یہاں کی نشست زندگی کی روزانہ ضروریات میں داخل ہو گئی ہے۔

یہ قہوہ خانے مختلف مدارج کے ہیں۔ متوسط درجہ کے قہوے خانے شہر کے اکثر اطراف میں موجود ہیں۔ مگر اعلیٰ درجہ کے قہوہ خانے بیشتر ازبکیہ میں ہیں۔ اور اعلیٰ درجے کے لوگ اکثر اسی جگہ آتے ہیں۔

سواری کا انتظام قاہرہ کی موجودہ آبادی جسقدر دور دراز حدوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اور تجارتی کاروبار کو جو روزافزوں ترقی حاصل ہے اُسکے لحاظ سے لوگوں کی آمدورفت اور کاروبار کے جلد انصرام ہونے کی ضرورتوں نے متعدد قسم کی سواریاں نکال دی ہیں۔ شہر کی تمام بڑی بڑی سڑکوں پر برقی

ٹریموے جاری ہے۔ جس کا صدر مقام ازبکیہ ہے۔ عباسیہ۔ بولاق۔ اور قلعے کی ٹریم گاڑیاں اسی جگہ کراس کرتی ہیں۔ امرا کے واسطے کرایہ کی بگھیاں بڑے بڑے چوکوں میں موجود رہتی ہیں لیکن ان سب سے زیادہ سستی اور ہر جگہ اور ہر وقت دستیاب ہونے والی سواری گدہے کی ہے۔

مصر میں گدہے بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اور پان پان سو روپیہ کو بکتے ہیں۔ اُن پر نہایت پُرتکلف زین کسے جاتے ہیں۔ اور ہر چوک میں صبح سے دس بجے رات تک موجود رہتے ہیں۔ جب کوئی شخص گدہے پر سوار ہوتا ہے تو گدہے والا ایک چابک گدہے کی پیٹھ پر لگاتا ہے اور گدھا دوڑنے لگتا ہے۔ گدہے والا بھی ساتھ ساتھ دوڑتا جاتا ہے۔ یہ سواری مصر میں اس قدر مروج ہے کہ سوداگر اور شرفا گدہے پر چڑھنے کو کچھ معیوب نہیں سمجھتے۔ بلکہ عورتیں بھی بے تکلف سوار ہوتی ہیں۔ اور خوب جمکر بیٹھتی ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے امرا اور سیاح جو قاہرہ میں آتے ہیں۔ علی العموم گدہوں ہی پر سوار ہوتے ہیں۔ گدہے والے اس قدر بے باک ہیں کہ یوروپین مسافروں کو گدھا دکھا کر کہتے ہیں "گوڈ ڈونکی سر صاحب بہت اچھا گدہا"۔ گدہے والوں کو چونکہ اکثر پردیسیوں سے کام پڑتا رہتا ہے اس واسطے اُنھوں نے انگریزی۔ فرانسیسی۔ اٹالین۔ وغیرہ زبانوں کے چند الفاظ یاد کر رکھے ہیں۔ اور اُن سے اپنا کام چلا لیتے ہیں۔ عرب ان گدہے والوں کو حمّار کہتے ہیں۔

قاہرہ کے اکثر مشائخ اور اہل علم کے ہاں سواری کے واسطے اپنے گدہے موجود رہتے ہیں۔ میں نے دو تین شخصوں سے اس کی وجہ پوچھی۔ تو اُنھوں نے

بیان کیا کہ گھوڑے کے واسطے دانہ گھاس اور ایک آدمی ملنے دلنے کو درکار ہے
جس کے مصارف کی میزان ۶۰؎ ساٹھ روپے ماہوار سے کم نہیں ہوتی۔
لیکن گدھے کے واسطے سائیس کی کچھ ضرورت نہیں تھوڑے سے جَو اور
تھوڑی سی گھاس اس کی گذران کے واسطے کافی ہے۔

حجام | حجاموں کی یہاں کثرت ہے۔ اور ان کا کام خوب چلتا ہے۔
مصری لوگ بالعموم داڑہی منڈواتے ہیں۔ اس واسطے ہر شخص روز کے
روز ورنہ دوسرے دن تو ضرور ہی حجام کی دوکان پر آموجود ہوتا ہے۔ ان
حجاموں کی دوکانیں ہر طرح آراستہ ہوتی ہیں۔ اکثر دوکانوں میں
قدآدم لمبا آئینہ دیوار میں لگا رہتا ہے۔ آئینہ کے نیچے ایک میز دیوار سے
لگی ہوئی ہوتی ہے۔ اور میز کے سامنے دو کرسیاں بچھی رہتی ہیں مقابل
کی دیوار سے ایک بنچ بھی لگی ہوتی ہے کہ جب زیادہ آدمی حجامت بنوانے
آجائیں تو وہ اس بنچ پر آرام سے بیٹھے رہیں۔ حجامت بنوانے والا کرسی پر
بیٹھ جاتا ہے اور آئینہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ حجام ایک سفید تولیہ گردن
سے چھاتی تک اور ایک تولیہ گدی سے کندھوں تک حجامت بنوانے والے
پر ڈال دیتا ہے۔ کہ اُس کے کندھوں پر بال نہ گریں۔ اور خود کھڑا ہوکر حجامت
بناتا ہے۔ حجامت انگریزی فیشن کی ہوتی ہے۔ موچنے سے بال اکھاڑنے کا
یہاں کوئی دستور نہیں۔ حجامت کے بعد اُسی جگہ حجام اُس کا سر منہ صابون سے
دہو دیتا ہے۔ اور بالوں میں خوشبودار تیل بھی لگا دیتا ہے۔ سر دُہلانے کے
واسطے چھت سے ایک زنجیر لٹکتی رہتی ہے اور اس میں پانی کا ایک لوٹا

بھرا ہوا لٹکا دیا جاتا ہے۔ جس کے نیچے کی طرف پیچدار ٹونٹی ہوتی ہے۔ حجامت بنوانے والے کے آگے ایک لگن رکھدی جاتی ہے۔ جس کا ایک کنارہ ہلالی شکل کا کٹا ہوا ہوتا ہے۔ اور اسی کٹی ہوئی جگہ میں حجامت بنوانے والے کی گردن آجاتی ہے۔ پیچ پھراتے ہی ٹونٹی کا پانی سر پر گرنے لگتا ہے۔ اور حجام اپنے ہاتھ سے سر اور مُنہ دھوتا جاتا ہے۔ ہر دوکان میں پانی کا نلکا بھی لگا ہوتا ہے۔ اس سبب سے پانی دوکان میں ہر وقت بافراط رہتا ہے۔ حجامت کی اُجرت عموماً دو قرش یعنے ۵ ر دینی ہوتی ہے:

ان حجاموں کے مصارف بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔ قریب ۵۰۔۶۰ قرش یعنے للعہ۔ للعہ روپیہ کے تو دوکان کا کرایہ ہوتا ہے۔ اور دوکان کا ضروری سامان سو ڈیڑھ سو روپیہ کے صرف سے بہم پہونچایا جاتا ہے یہ حجام نہایت اجلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ایک دو شاگرد خوبصورت بطور خدمتگار بھی ان کے پاس حاضر رہتے ہیں۔ ایک حجام کا جو معاملہ میری نظر سے گذرا اُس سے ان لوگوں کی خوش پوشی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

میں کچھ دنوں تک ایک ایسے شخص کے مکان میں کرایہ پر رہتا تھا جو خود بھی کبھی کبھی میرے پاس آجاتا تھا۔ ایک روز مالک مکان میرے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا اور مَیں حسب معمول کتاب دیکھ رہا تھا۔ کہ اتنے میں ایک نوجوان لڑکا جو بہت خوبصورت مکلف لباس پہنے ہوا تھا۔ اس مکان میں آیا۔ اور ایک کمسن لڑکا ولایتی چمڑے کا بیگ اُٹھائے ہوئے اسکے ساتھ تھا۔ میں سمجھا کہ یہ معزز نوجوان مالک مکان کا مہمان ہے۔ وہ سلام علیک کے بعد چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر

میں مالک مکان نے پگڑی اپنے سر سے اُتاری اور نوجوان نے بیگ کھولکر اُسترے کو جمپوٹے پر لگانا شروع کیا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ مہمان نہیں بلکہ حجام کا شاگرد ہے۔ جو شیخ کی حجامت بنانے آیا ہے۔

حمّام اس ملک کے حالات کے لحاظ سے غسل حمام صحت جسمانی کے واسطے بہت ضروری سمجھا گیا ہے۔ کوئی عمدہ محلہ ایسا نہ ہوگا۔ جو حمام سے خالی ہو۔ مردوں سے قطع نظر عورتیں بھی ہفتہ وار حمّام میں جاتی ہیں۔ ان اوقات مختص پر حمام مردوں سے خالی ہو جاتا ہے۔ یہ حمام ایسے اعلیٰ درجے کے ہیں۔ کہ ہندوستان کے موجودہ حماموں کو جو دہلی لاہور پشاور اور بمبئی میں بنے ہوئے ہیں۔ بطور تمثیل بھی ان کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شاید شاہی زمانے میں کوئی حمام اس عظمت و شان کا یہاں ہو تو ہو۔

ان حماموں میں جس طرح نہانے والے کی آؤ بھگت ہوتی ہے قابل غور ہے۔ پہلے درجے میں کپڑے اُتارنے کے واسطے ایک نہایت عمدہ مکان ہوتا ہے۔ متعدد خدمتگار حاضر رہتے ہیں۔ کپڑے اُتارنے کے بعد ایک لنگی بندھوائی جاتی ہے۔ ایک کپڑا بدن پر لپیٹوایا جاتا ہے۔ ایک تولیہ سر پر بندھوایا جاتا ہے۔ پاؤں میں کھڑاویں پہنائی جاتی ہیں۔ اور اس ہیئت کے ساتھ وہ دوسرے درجے میں جاتا ہے۔ یہ غسل کا کمرہ ہے۔ اس جگہ خدمتگار کپڑے اُترواتے ہیں۔ اور صرف غسل کی لُنگی باقی رہتی ہے۔ تعلیم یافتہ اشخاص کے سوا بوڑھے اور جوان لُنگی کی بھی پروا نہیں کرتے۔ برہنہ ہو کر غسل کرتے ہیں۔ شیخ ابن بطوطہ کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی برہنہ غسل کرنیکا رواج تھا۔ چنانچہ شیخ نے

اس بے حیائی سے بیزار ہوکر والی شہر سے شکایت کی تھی۔ اور اس پر حامیوں کو تنبیہ کی گئی تھی۔

میں نے چند اہل علم سے اس برہنہ غسل کرنے پر اظہار تعجب کیا۔ ایک ظریف نے کہا کہ مصری لوگ قدیم زمانے سے بے حیائی میں مشہور ہیں۔ اور قرآن مجید میں بھی اس کا تذکرہ ہے۔ میں نے کہا کس جگہ؟ اس نے حضرت یوسف اور زلیخا کا مختصر قصہ بیان کرنے کے بعد یہ آیت پڑھی یُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْبِكِ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخَاطِئِیْنَ (ترجمہ) یوسف تو اسکا کچھ خیال نہ کر اور زلیخا تو اپنے گناہ بخشوا بیشک تو گنہگار تھی"۔ اور کہا کہ جب حاکم وقت اپنی بیوی کی خواہش زنا کا حال دریافت ہونے پر ایسے نرم الفاظ میں ملامت کرنا کافی سمجھے تو رعایا کی عزت اور حمیت کا کیا حال ہوگا۔

نہانے کے واسطے گرم پانی اور سرد پانی کے حوض جدا گانہ ہوتے ہیں۔ جو شخص کیسہ (مالش) کرانا چاہے اس کے واسطے دلاک موجود ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے غسل خانے بھی ہوتے ہیں۔ پہلے اور دوسرے درجے کے راستے میں ایک طرف کو قضائے حاجت کے واسطے بھی جگہ ہوتی ہے۔ غسل سے فارغ ہوکر خشک لنگی بندھوائی جاتی ہے۔ اور غسل کرنے والا پہلے درجے میں آجاتا ہے۔ اور کپڑے پہنکر چند منٹ بچھونے پر لیٹ جاتا ہے جو تکلف سے زمین پر بچھا ہوا ہوتا ہے۔ خدمتگار تھوڑی دیر تک سر سے پانوں تک چمپی کرتا ہے۔

معمولی غسل کی اُجرت دو قرش یعنے ۵ ر دی جاتی ہے۔ اور کیسے

کی اُجرت ایک قرش ہوتی ہے۔ آدھا قرش خدمتگار دن کو اس کے علاوہ دیا جاتا ہے۔ اِن حماموں میں چا رو غیرہ خورد نوش کی چیزیں بھی حاضر رہتی ہیں۔ یہ حمام اس قدر بڑے ہیں کہ ایک وقت میں پندرہ بیس آدمی بآسانی غسل کر سکتے ہیں۔

تعلیم

قاہرہ میں علوم قدیمہ اور جدیدہ کی تعلیم ہندوستان کی طرح ابتک علحدہ علحدہ ہوتی ہے۔ علوم قدیمہ کی درس گاہوں میں سب سے زیادہ مشہور عظیم الشان۔ قدیم ونامور مدرسہ جامع ازہر ہے۔ مَیں اسی مدرسہ کو تعلیمی حالات کی تمہید قرار دینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ تعلیم ہی کا شوق مجھے ہندوستان سے کھینچکر مصر لے گیا۔ اور اتنے عرصے تک وہاں ٹھہرے رکھنے کا باعث ہوا۔ آخر میں علوم جدیدہ کے مدارس کا حال لکھوں گا۔ جنسے اہل مصر کی ترقی متصور ہے۔

جامع ازہر مصر اور اُس کے صدر مقام قاہرہ کو جو شہرت اور وقعت اسلامی دنیا میں حاصل ہوئی اُسکی ایک بڑی وجہ عربی زبان اور دینی علوم کی ترقی ہے۔ جس کا مرکز صدیوں سے جامع ازہر کی یونیورسٹی چلی آتی ہے۔ مورخوں کی رائے ہے کہ ازہر سے زیادہ قدیم کوئی دارالعلوم دنیا میں نہیں ہے۔ درحقیقت یہ ایک مسجد ہے جو دولت فاطمیہ کے سپہ سالار جوہر نے سب سے پہلے قاہرہ میں تعمیر کرائی۔ ۳۵۹ھ ہجری مطابق ۹۶۹ء میں اس مسجد کی تعمیر شروع ہوئی۔ اور ۳۶۱ھ ہجری میں خاتمہ کو پہونچی۔ المعز لدین اللہ کے عہد میں یہ مسجد بیت العلوم قرار دیگئی۔ اور اس کے جانشینوں کی سلطنت میں برابر اسے ترقی ہوتی رہی۔ مختلف سلاطین۔ وزراء۔ امرا۔ ورؤسا اپنے اپنے عہد میں محبت اسلام وترقی علوم کی غرض سے اسکی امداد کے لئے جائدادیں وقف کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ یہ مسجد دنیائے اسلام کی مشہور ومعروف درس گاہ بنگئی۔ یہ وقف شدہ زمینیں اور مکانات

ابتک موجود ہیں۔ اور انہی کی آمدنی سے ازہر کے جملہ مصارف ادا ہوتے ہیں۔ ان جائداوں کا انتظام گورنمنٹ مصر کے متعلق ہے جس نے محکمہ اوقاف ان مقاصد کی تکمیل کے واسطے خصوصیت سے مقرر کر رکھا ہے۔ اس محکمہ میں آمدو خرچ کی پوری نگرانی ہوتی ہے۔

جس زمانے میں اس یونیورسٹی پر شباب کا عالم تھا اسمیں علوم عربیہ کے سوا۔ ریاضی۔ طب۔ ہیئت۔ تقویم البلدان اور فلسفۂ اسلامی کی تعلیم بھی ہوا کرتی تھی مقامات دوردراز سے طالب علم اسکی ترقی کا شہرہ سنکر آتے تھے اور یہاں تعلیم پانیکے بعد دنیا کے مشہور ادیب۔ فقیہ اور حکیم شمار ہوتے تھے۔ مگر اس وقت "ہر کمالے را زوالے" کی مثل ازہر پر صادق آتی ہے تحصیل کا دارمدار صرف ونحو۔ فقہ اور کسیقدر علوم ادبیہ کی تعلیم پر ہے۔ علوم عقلیہ کی تعلیم بالکل جاتی رہی۔ تاہم جامع ازہر کا وجود مغتنمات سے ہے۔ بغداد۔ شیراز اور بخارا کے نامور وعظیم الشان اسلامی مدارس دستبرد روزگار سے نیست ونابود ہو گئے۔ زمانہ کے انقلاب نے ایک دنیا کو زیروزبر کیا۔ مگر جامع ازہر ساڑھے نوسو برس تک حکومتوں کے تغیر وتبدل اُٹھانیکے بعد اب بھی اُسی طرح علم وفضل کا مرکز مانی جاتی ہے۔ اور اب زوال کی حالت میں مشرقی علوم کی یہی ایک آخری اُمیدگاہ نظر آتی ہے جسمیں تونس۔ مراکو۔ الجزائر طرابلس الغرب۔ روم۔ شام۔ کردستان۔ بغداد۔ افغانستان۔ ہندوستان۔ حتّٰی کہ حرمین شریفین تک کے لوگ تحصیل علم کی غرض سے کھچے چلے آتے ہیں۔

بلحاظ تعداد طلباء جامع ازہر دنیا بھر کی تعلیم گاہوں پر شرف رکھتی ہے۔ اور امریکہ۔ جرمنی۔ انگلستان اور بلجیم کی مشہور یونیورسٹیوں میں کوئی بھی اس سے لگا

نہیں کھا سکتی۔ ازہر میں اس وقت قریباً دس ہزار طالب علم اور تین سو مدرس ہیں طالب علموں کو الف بے سے لے کر علوم عربیہ کی انتہائی تعلیم تک دیجاتی ہے۔ مگر اسمیں تحقیق و اجتہاد کے مدارج بخوبی طے نہیں ہوتے۔ پہلے متن حفظ کرایا جاتا ہے۔ پھر اسکی شرح اور پھر شرح کے حاشیئے اور حاشیوں کے حواشی پڑھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں۔ حاشیہ در حاشیہ کے پڑھنے میں طالب علم اکثر ایسی بحثوں پر وقت صرف کرتے ہیں جو آئندہ زندگی میں بالکل کار آمد نہیں ہوتیں۔ پڑھانے کا طریق یہ ہے کہ ۲۰۔ ۳۰۔ ۴۰۔ ۵۰ طالب علموں کی ایک جماعت اُستاد کے سامنے مسجد کے فرش پر بیٹھ جاتی ہے۔ اور اُستاد ایک معمولی چوبی کرسی پر بیٹھا ہوا کتاب میں سے سبق کی عبارت شاگردوں کے سامنے پڑھتا جاتا ہے۔ اگر کسی طالب علم نے کوئی بات پوچھی تو اسکی تشریح کر دیتا ہے۔ مگر اپنی طرف سے بہت کم دخل دیتا ہے۔ اسی طرح مسجد کے تمام کمروں میں درس ہوتا رہتا ہے۔ اور طلبا اپنی ضروریات و مشکلات خود سمجھکر اُستاد سے حل کر لیتے ہیں۔ حاضری کا کوئی رجسٹر نہیں رکھا جاتا۔ جس سے اُستاد کو معلوم ہوتا رہے کہ طلبا میں کتنے حاضر اور کتنے غیر حاضر ہیں۔ درس صبح سے شام تک برابر جاری رہتا ہے۔ طالب علم اسی کے دوران میں وقتاً فوقتاً نماز پنجگانہ کھانے پینے۔ دوپہر کے سونے اور دیگر ضروریات کا انصرام کرتے رہتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو قرآن شریف پڑھایا اور تجوید و قرأت سکھائی جاتی ہے۔ سات برس کے بچوں سے لے کر ستر برس تک کے بڈھے یہاں نظر آتے ہیں۔ بہت سے ایسے طالب علم ہیں جنہوں نے اپنی عمریں اسمیں صرف کر دی ہیں۔ بعض طالب علم اسی جگہ شادی کر لیتے ہیں۔ اور دنیوی کاروبار

انجام دینے کے ساتھ ساتھ ازہر میں پڑھتے بھی رہتے ہیں۔

یہاں کے مدرّس شیخ کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔ عمومًا ہر فن کے واسطے ایک عالم علیحدہ ہوتا ہے۔ جو اپنی شاخ کا شیخ کہلاتا ہے۔ یہاں کے علماؑ کی تدریس میں ایصال ثواب پر نظر ہوتی ہے۔ اور تنخواہیں صرف گذارہ کے لائق ملتی ہیں۔ البتہ مدرّس اوّل جو شیخ الازہر کہلاتے اور پرنسپلی کا درجہ رکھتے ہیں اُن کا مشاہرہ اس وقت ۱۲۰ پونڈ یا ایک ہزار آٹھ سو روپیہ ماہوار ہے۔ یعنی ۷۰ پونڈ بحیثیت شیخ الازہر اور ۵۰ پونڈ بحیثیت مفتی بلاد مصر کے اُنہیں ملتے ہیں۔ شیخ الازہر کا منصب مصر میں بہت معزز سمجھا جاتا ہے۔ اور دیگر بلاد اسلامیہ کے لوگ بھی اُنہیں بنظر احترام دیکھتے ہیں۔ اس وقت اس جگہ پر شیخ حصونہ مقرر ہیں۔ جو تقرر سے پہلے طبقۂ علماؑ میں خاص وقعت حاصل کرچکے تھے۔ مجھے ان سے ملنے کا کئی مرتبہ اتفاق ہوا۔ اور میں نے انہیں بہت خلیق۔ متواضع اور دیگر معاملات میں باخبر پایا۔

جو طالب علم اس درسگاہ میں رہتے ہیں ان کے واسطے ملک ملک کے لحاظ سے الگ الگ مکانات بنے ہوئے ہیں جو عمومًا ازہر اور اس سے ملے ہوئے کمروں کی چھتوں پر واقع ہیں۔ مصری لوگ انہیں رواق کہتے ہیں۔ اور بلاد مختلفہ سے نسبت دیتے ہیں۔ مثلاً رواق شام۔ رواق مغاربہ وغیرہ ہر رواق میں اس ملک کے اوقاف کے موافق کمروں کی تعداد معین ہے۔ ایک ملک کے طالب علم کو دوسرے ملک کی رواق میں رہنے کی اجازت نہیں۔ چاہے اسکا رواق پُر اور دوسرے میں ضرورت سے زیادہ جگہ خالی ہو۔ اسی طرح

ہر رواق کے واسطے طلباء کی تعداد بھی معین ہے۔ جنہیں اُس رواق کے مقررہ اوقاف کی آمدنی میں سے ماہوار کچھ نقدی اور ایک دن بیچ کئی روکھی روٹیاں ملتی رہتی ہیں۔ جب تک مقررہ تعداد میں سے کوئی طالب علم جگہ خالی نہ کرے نئے کو اوقاف سے مدد نہیں مل سکتی۔ ہر رواق میں ایک شیخ الرواق بھی رہتا ہے۔ جو طلباءً کے داخل خارج کا نگراں اور کم استعداد طلباء کو اپنی زبان میں تحصیل علم کے متعلق مدد دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس شیخ کو تھوڑی سی نقدی اور کچھ روکھی روٹیاں اوقاف سے ملتی رہتی ہیں۔ جب کوئی نیا طالب علم باہر سے آکر ازہر میں داخل ہونا چاہتا ہے تو شیخ الازہر اس ملک کے شیخ الرواق سے طلباء کی موجودہ تعداد دریافت کرتا ہے اور گنجائش ہونے کی صورت میں اُسے رہنے کی اجازت دے دیتا ہے ورنہ اُسے شہر میں کرایہ کا مکان لے کر رہنا پڑتا ہے تاوقتیکہ اُسکے ملکی رواق میں جگہ خالی ہو۔ اِس وقت کئی ہزار طالب علم کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہیں جنمیں سے بعض گھر سے آسودہ ہیں۔ اور جگہ ملنے پر بھی ازہر میں سکونت رکھنا اور وہاں سے مدد لینی نہیں چاہتے۔

ہندوستانی طلباء کے واسطے جامع ازہر میں فقط دو کمرے ہیں۔ ایک میں شیخ الرواق رہتا ہے اور دوسرے میں طلباء۔ اس وقت تین ہندوستانی طالبعلم رواق ہندی میں رہتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کو صرف پانچ روکھی روٹیاں دوسرے دن ملتی ہیں۔ اس رواق کی اوقاف کی قلت کے باعث طلبا کو نقدی نہیں ملتی۔ شیخ الرواق ایک عرب ہے جو اردو کا کوئی کوئی جملہ بول سکتا ہے۔ کسی ہندوستانی عالم کے نہ ملنے سے یہ شخص شیخ الرواق ہو گیا۔ ورنہ قابلیت نام کو نہیں

بہت ضعیف اور کم علم آدمی ہے۔ ہندی اوقاف کی موجودہ آمدنی اس قدر نہیں کہ کوئی مفلس ہندوستانی طالب علم ازہر میں رہکر بلا خرچ تعلیم پا سکے۔ البتہ جو شخص اپنے خرچ سے یہاں رہنا چاہے وہ تحصیل علم میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ میری رائے میں کم از کم عـہ ماہوار کا ہر طالب علم کو خرچ کے واسطے انتظام کرنا چاہیئے۔ ایک لائق طالب علم جو گذشتہ سال یہاں آیا تھا۔ یہی حالات دیکھکر چند روز کے بعد شام کو چلا گیا۔

ازہر میں سالانہ امتحان لے کر جماعت چڑھانے کا کوئی قاعدہ مقرر نہیں نہ جغرافیہ۔ تاریخ اور ریاضی سے طالب علموں کو کچھ واقفیت ہوتی ہے۔ بلکہ بعض طالب علم تو معمولی نوشت وخواند بھی بمشکل کر سکتے ہیں۔ یہ حالات دیکھکر علی پاشا مبارک نے جو پچھلے دنوں سر رشتہ تعلیم مصر کے ڈائرکٹر اور علاوہ علوم عربیہ کے علوم ریاضیہ کے بہت بڑے ماہر تھے - تعلیم ازہر کے متعلق ضروری اصلاحیں پیش کی تھیں۔ مگر یہاں تمام مشائخ ان کے مخالف ہو گئے۔ اور شیخ الازہر کے مذہبی اقتدار کے باعث پاشائے موصوف کی تجاویز کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ حال میں شیخ محمد عبدہٗ نے جو بہت بڑے عالم روشن خیال بزرگ ہیں۔ اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے اسباب پر ہمیشہ غور کرتے رہتے ہیں پھر ازہر کی اصلاح میں کوشش کی۔ چنانچہ انکی حسن تدبیر اور وجاہت ذاتی سے طرز تعلیم میں بعض مفید تغیرات شروع ہو گئے ہیں۔ نصاب تعلیم میں بھی ترقی ہو چلی ہے۔ جغرافیہ تاریخ۔ حساب کی تعلیم کے علاوہ ایک خوشنویس بھی طالب علموں کا خط درست کرنے کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ سالانہ امتحان وترقی جماعت کے قواعد بھی بنائے گئے ہیں۔ اگرچہ مشائخ ازہر

ان کی اصلاحوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے مگر ان کے ذاتی اقتدار اور حکام سے رسوخ ہونے کے باعث کھلم کھلا مخالفت نہیں کر سکتے۔

دار العلوم جب انقلاب زمانہ سے تعلیم ازہر کی حالت اس درجہ پر پہونچگئی کہ صرف و نحو۔ فقہ اور علوم ادبیہ کے سوا دیگر علوم مفیدہ اس میں سے معدوم ہوگئے اور یہاں کے طلبا، صرف واعظ و منادیا مدرس کے منصب پر کرنے کے قابل رنگئے تو وقت کی ضرورت اور زمانہ کی رفتار نے گورنمنٹ مصر کو علوم عربیہ کا ایک ایسا دار العلوم کھولنے پر آمادہ کیا جس میں مشرقی علوم کے ساتھ مغرب کے وہ علوم بھی داخل درس کئے جائیں جنکی ملک اور قوم کو اس وقت ضرورت ہے۔ سب سے پہلے جس شخص کو یہ ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ غالباً علی پاشا مبارک ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم مصر تھے۔ اُن کی تجویز سے یہ دار العلوم اعلیٰ پیمانہ پر قائم ہوا۔ اور مفصلہ ذیل علوم کی تعلیم اُس میں شامل کی گئی۔ صرف و نحو۔ عربی علم ادب۔ فن بلاغت۔ فن انشاد۔ رسم الخط۔ عروض۔ قوافی۔ فقہ۔ اصول فقہ۔ تفسیر۔ حدیث۔ عقائد۔ منطق۔ حساب۔ ہندسہ۔ جبر و مقابلہ۔ تاریخ عام۔ تاریخ طبعی۔ جغرافیہ۔ نقشہ کشی۔ مصوری۔ طبعیات۔ و کیمیا۔

تعلیم کے ساتھ اس امر پر بھی خاص توجہ مبذول کیجاتی ہے کہ طالب علموں کو شائستہ عربی نظم و نثر لکھنے کی لیاقت اور شستہ تقریر کی مہارت پیدا ہو۔ جو طالب علم اس دار العلوم میں آتے ہیں وہ اکثر ازہر کے پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر جب تک داخلہ کے امتحان سے اُن میں مقررہ درجہ کی قابلیت دیکھ نہیں لیجاتی وہ دار العلوم میں داخل نہیں کئے جاتے۔ اس طرح یہ دار العلوم گویا ہونہار ازہر لوں

کی ترقی کا ایک زینہ ہے۔ اِن کے لئے اس دار العلوم میں داخل ہونے کی ایک خاص ترغیب یہ ہے کہ انہیں پندرہ روپیہ ماہوار وظیفہ اور دن کا کھانا ملتا ہے

دار العلوم میں صرف چار سال تعلیم ہوتی ہے۔ اور فقہ حدیث اور تفسیر کی نسبت علم ادب اور علوم جدیدہ کے پڑھانے میں زیادہ کوشش کیجاتی ہے۔ تدریس کے واسطے مصر کے مستند اور نامور علمار مثل شیخ حمزہ فتح اللہ ادیب اور شیخ حسن[۵۱] طویل محدث منتخب کئے گئے ہیں۔ جن کا تبحر علوم پختگی معلومات اور تعلیم کی لیاقت مصر میں مسلّم ہے۔ یہ لوگ کتابی تعلیم کے عوض زبانی درس دیتے ہیں۔ اور اس سلاست اور خوبی سے تقریر کرتے ہیں کہ سبق کے مطالب بخوبی طلبا کے ذہن نشین ہو جاتے ہیں۔ ازہر کی تعلیم اور دار العلوم کی تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہاں عمر کا ایک بڑا حصہ حواشی در حواشی کی بحثوں میں صرف ہوتا ہے۔ اور یہاں چار برس میں ضروری علوم کی اتنی واقفیت بہم پہونچتی ہے کہ طالب علم میں وسعت خیال اور روشن دماغی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے بعد ذاتی مطالعہ سے وہ ایک بہت بڑا عالم فاضل بن سکتا ہے۔ ایک اور بڑا فائدہ دار العلوم کا جو اکثر طلبار کے لئے موجب ترغیب ثابت ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کا آخری امتحان پاس کرنے کے بعد سرکاری مدارس کی ملازمت کا استحقاق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ سندیا فتوں کو سول کے عہدے بھی ملجاتے ہیں۔

تعلیم عام باشندگان ملک کی عام ضرورتوں کی خاطر جدید طریقہ تعلیم کے جو مدرسے گورنمنٹ مصر نے جاری کئے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

---

۵۱ افسوس کہ شیخ حسن طویل اسی سال میں انتقال کر گئے ہیں۔

۱- مدارس ابتدائی۔ جنکی تعلیم ہندوستان کے پرائمری اسکولوں سے کسی قدر زیادہ ہے۔

۲- مدارس تجہیزی۔ جن کی تعلیم ہمارے ہاں کے انٹرنس کی مانند ہے۔

مدارس ابتدائی کا زمانۂ تعلیم چار برس مقرر ہے۔ اور مفصلہ ذیل مضامین ان میں پڑہائے جاتے ہیں۔ (۱) عربی (۲) انگریزی یا فرانسیسی میں سے ایک زبان (۳) جغرافیہ (۴) حساب۔ عربی زبان کے درس میں قرآن مجید کے آخری دو پارے اور کتاب عقاید بھی داخل ہے۔ ترکی زبان کی تعلیم اختیاری ہے۔ مگر فارسی کا نام تک نہیں۔ ان مدرسوں میں یہ کوشش کیجاتی ہے کہ طالب علم کو عربی زبان بخوبی لکھنی پڑھنی آجائے۔ اسی وجہ سے جغرافیہ اور تاریخ بھی عربی میں پڑہائے جاتے ہیں۔ چونکہ عربی یہاں کے لوگوں کی مادری زبان ہے اور مضامین داخل درس بھی تھوڑے ہیں۔ اس لئے طلبار کو چار برس میں اس زبان کے لکھنے پڑھنے کی اچھی مہارت پیدا ہوجاتی ہے۔ اس درجہ کا آخری امتحان پاس کرنے سے ادنیٰ درجہ کی سرکاری ملازمت کا استحقاق بھی حاصل ہوجاتا ہے۔

مدارس تجہیزی کی مدت تعلیم پانچ برس ہے۔ ان میں طالب علموں کی توجہ انگریزی یا فرانسیسی زبان کی تکمیل پر زیادہ صرف کیجاتی ہے۔ عربی زبان کے سوا جغرافیہ۔ تاریخ۔ ریاضی وغیرہ جتنے مضامین داخل درس ہیں وہ انگریزی یا فرنچ میں پڑہائے جاتے ہیں۔ ان کی تعلیم کے واسطے یوروپین پروفیسر بھی انگلستان سے بلائے گئے ہیں۔ فرانسیسی چونکہ تمام سلطنتوں کی لنگوافرنیکا یعنے مشترکہ زبان ہے

اور مصر و دول یورپ کی باہمی خط وکتابت اسی زبان میں ہوتی ہے۔ اس لئے سرکاری مدارس میں اس زبان کی تعلیم لازمی قرار دیگئی ہے۔ پہلے عرصۂ دراز تک فرانسیسی کو مصر میں بڑا فروغ تھا۔ مگر جب سے مصر کے نظم ونسق میں انگلستان کی مداخلت شروع ہوئی۔ انگریزوں کا اثر فرانسیسیوں کے مقابلے میں بڑھنے لگا۔ فی زماننا فرانسیسی زبان کی تعلیم میں دن بدن کمی اور انگریزی کو یوماً فیوماً ترقی ہے۔

یہاں کے تعلیمی انتظام میں دو باتیں خصوصاً قابل ذکر ہیں (۱) یہ کہ تعلیم چار گھنٹے صبح اور دو گھنٹے سہ پہر کو ہوتی ہے۔ (۲) یہ کہ زبانوں کے ممتحن الگ ہوتے ہیں۔ اور علوم کے ممتحن الگ۔ انکو یہاں کی اصطلاح میں مفتش کہتے ہیں۔ اور ہر مفتش اپنے امتحان کا پرچہ اور اپنی رائے اپنی زبان میں لکھتا ہے عربی دان عربی میں۔ فرنچ جاننے والا فرانسیسی میں اور انگریزی خوان انگریزی میں تحریر کرتا ہے۔

سرکاری ملازمت میں اگرچہ مندرجہ بالا مدارس کے پاس شدوں کو ترجیح دیجاتی ہے۔ اور ہندوستان کی طرح یہاں بھی لوگ روزگار کی خاطر تعلیم حاصل کرتے ہیں لیکن عموماً باشندگان مصر کا میلان طبع قدیم تعلیم کی جانب اب تک بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ جامع ازہر کے طالب علموں کی کثرت اور مدارس جدیدہ کے طلباء کی قلت یہ امر بخوبی ثابت کررہی ہے۔ مدارس ابتدائی کے سالانہ امتحان کا جو نتیجہ ۲۳ جولائی ۱۸۹۸ء کو نظارۃ المعارف العمومیہ یعنے سررشتۂ تعلیم نے مشتہر کیا۔ اس سے پایا جاتا ہے۔ کہ کل امیدواروں کی تعداد ۱۸۱۳ تھی۔ جن میں سے ۷۲۴ حسب ذیل پاس ہوئے:۔

۳۷ - مدارس سرکاری کے	۸۱۲	طالب علموں میں سے	۳۳۳
۳۰ - مدارس غیر سرکاری کے	۲۶۵	" "	۶۸
پرائیویٹ "	۳۰۴	" "	۲۶
کل	۱۳۸۱		۴۲۷

اِنمیں انگریزی خواں امیدواروں کی تعداد ۶۱۴ اور فرانسیسی پڑھنے والوں کی تعداد ۷۶۷ تھی۔

دیگر مدارس مصر میں ابتک اعلیٰ تعلیم کے واسطے کوئی کالج قائم نہیں ہوا۔ ہاں گورمنٹ مصر کی جانب سے مختلف علوم وفنون کے مندرجہ ذیل مدرسے الگ الگ قائم ہیں۔

(۱) مدرسۃ الطب (میڈیکل سکول)
(۲) مدرسۃ الحقوق (قانونی سکول)
(۳) مدرسۃ المہندس خانہ (انجینرنگ سکول)
(۴) مدرسۃ الصنائع (آرٹ سکول)
(۵) مدرسہ توفیقیہ (ٹریننگ سکول عربی خوان استادوں کے لئے)
(۶) مدرسہ خدیویہ (ٹریننگ سکول انگریزی خواں استادوں کے لئے)

مدرسۂ تجہیزی کی سند حاصل کرنے کے بعد طلباء اپنے مذاق کے موافق ان مدرسوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ مدرسۃ الطب میں فنِ طبابت کی نئی کتابیں فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ کرکے داخل درس کی گئی ہیں۔ مدرسۃ الحقوق میں شریعت اسلام کی کتابیں عربی میں پڑھائی جاتی ہیں اور رومن لا کی تعلیم فرانسیسی میں ہوتی ہے۔ مدرسۃ المہندس خانہ اور مدرسۃ الصنائع میں فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں تعلیم دیجاتی ہے۔

یوروپ میں تعلیم پانے والے مصریوں نے علوم جدیدہ میں جتنی ترقی

کی ہے وہ انکو فرانس کی بدولت نصیب ہوئی ہے۔ محمد علی پاشا کے زمانے سے فرانس کے باکمال لوگوں کا داخلہ مدارس ملک میں شروع ہوا۔ جنکی حسن تربیت نے اہل مصر کو علوم جدیدہ سے فائدہ پہونچایا۔ علوم مفیدہ وفنون نفیسہ کی کتابیں فرانسیسی زبان سے عربی میں ترجمہ ہونے لگیں۔ فرانسیسی زبان جاننے والے قوم اور سلطنت کے نزدیک معزز قرار پائے۔ اور سرکاری اسامیوں پر انکا حق بالاتر سمجھا گیا ہے۔ اِن وجوہ سے مصریوں کی توجہ فرانس جانے اور وہاں رہکر تعلیم پانے پر بیشتر مائل ہوگئی۔ گورنمنٹ مصر نے وظیفہ دے کر طالب علموں کی ہمت بندھائی۔ اور متموّل اصحاب اخراجات سفر کے متکفل ہوئے۔ کچھ عرصہ تک گو اس تعلیم کا نتیجہ حسب دلخواہ نہیں نکلا۔ مگر اب مصر کے بڑے بڑے مصنف اور سلطنت کے معزز عہدہ دار وہی لوگ نظر آتے ہیں جنہوں نے پیرس سے قابلیت کی سند حاصل کی ہے۔ یا پرائیویٹ طور پر فرانسیسی میں کمال پیدا کرلیا ہے جب سے انگریزوں کی مداخلت ہوئی ہے۔ مصریوں میں لندن جانے کا شوق دن بدن ترقی پر ہے۔ بعض لوگ علوم جدیدہ سیکھنے کی غرض سے سویٹزرلینڈ اور جرمنی بھی چلے جاتے ہیں۔

عربی انگریزی کتابیں سلطنت انگریزی کی مداخلت سے یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ طالب علموں کے لئے انگریزی زبان سیکھنے میں سہولتیں پیدا کیجائیں۔ اسی بنیاد پر ابتدائی مدارس کے لئے مصری محکمہ تعلیم نے ایسی کتابیں تالیف کرائی ہیں۔ جنکے ذریعہ سے انگریزی فقروں کا ترجمہ عربی میں اور عربی جملوں کا ترجمہ انگریزی میں بآسانی سیکھا جاسکتا ہے۔ یہ دو چھوٹے چھوٹے

رسالے ہیں۔

(۱) عربی ریڈر مصنفہ جرجیس میلاد ...... ۹۵ صفحہ پر

(۲) الاسلوب الوجیز مصنفہ مسٹر بورک۔ . . ۲۴۱ صفحہ پر

ان رسالوں کی طرزِ تحریر یہ ہے کہ ہر سبق میں پہلے عربی کے چند مفرد الفاظ درج کئے ہیں۔ اور ان کا ترجمہ انگریزی میں لکھا ہے۔ پھر متعدد فقرے انگریزی کے لکھے ہیں جنہیں وہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں کہ طالب علم اُنکی مدد سے ان کا ترجمہ عربی میں کرسکتا ہے۔ اسی طرح عربی فقرے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے واسطے دئے گئے ہیں۔

عربی الفاظ کے انگریزی معنے جاننے اور انگریزی لفظوں کے عربی معنے سمجھنے کے واسطے دو تین اسکول ڈکشنریاں بھی تیار کی گئی ہیں۔ جنہیں مصری لوگ قاموس انگریزی عربی کہتے ہیں۔ قاموس اصل میں عربی زبان کی ایک لغت ہے۔ جو قاموس فیروز آبادی کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن اب قاموس بمعنے لغت ایک اصطلاح بنگئی ہے۔ اور مصریوں نے اسکی نظیر پر ہر ایک ڈکشنری کو قاموس کہنا شروع کر دیا ہے۔ خواہ اس میں کسی زبان کے لفظ ہوں۔ ان کتابوں اور ڈکشنریوں کے مطالعہ سے اصل عربی کے علاوہ اکثر وہ نئے الفاظ بھی معلوم ہو جاتے ہیں جو غیر قوموں کے اختلاط اور یورپین ایجاد و اختراعات کے استعمال سے عربوں کو بنانے پڑے ہیں۔ یہ لفظ زمانۂ حال کی تمام تصانیف اور اخبارات میں بکثرت استعمال کئے جاتے ہیں اور کتنے ہی موقعوں پر اُنھوں نے قدیم عربی الفاظ کی جگہ بھی لے لی ہے جو اب نسیاً منسیا ہو چلے ہیں۔ لفظوں کے ساتھ

جملوں کی ترکیبیں بھی نئی بنگئی ہیں۔ اور پُرانی زبان میں اتنی بڑی تبدیلی واقع ہوئی ہے کہ ہمارے ہاں کے جید عالموں کو بھی زمانہ حال کی کتب عربیہ اور مصر و قسطنطینہ کے عربی اخبارات کا مطلب سمجھنے میں دِقّت واقع ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جدید قاموسیں نہ صرف طلبائے مدارس بلکہ تمام لوگوں کے لئے بڑی کارآمد ہیں۔ انکی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے:۔

(۱) قاموس عربی و انگریزی مولفہ ولیم طامسن در نبات۔ اس ڈکشنری میں عربی الفاظ کے معنے انگریزی میں لکھے ہیں۔ اسکی ضخامت متوسط تقطیع کے سات سو صفحے کی ہے۔

(۲) قاموس انگریزی و عربی مؤلفہ یوحنا ابکاریوس۔ اس ڈکشنری میں انگریزی الفاظ کے معنے عربی میں درج کئے گئے ہیں۔ اسکی ضخامت متوسط تقطیع کے ۷۰۰ صفحے کی ہے۔

(۳) قاموس عربی و انگریزی و انگریزی و عربی۔ مولفہ ڈاکٹر یوحنا ورنبات وڈاکٹر بولی بورتنہ۔ اسکے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں عربی الفاظ کے معنے انگریزی میں اور دوسرے میں انگریزی الفاظ کے معنے عربی میں مندرج ہیں۔ یہ دونوں حصے ۷۳۴ صفحے کی ضخامت رکھتے ہیں۔ اور ایک ہی جگہ مجلد کیے گئے ہیں۔

یہ قاموس ہر دو مندرجہ بالا لغات کی نسبت بہت مختصر ہے۔

ان درسی کتابوں اور لغتوں کے علاوہ ایک کتاب عربی انگریزی بول چال کے متعلق یعقوب نخلہ ایک نصرانی عالم نے تالیف کی ہے۔ اس کا نام "الابریز فی تعریب لغتہ الانگلیز"

۵۱ مؤلف نے عربی بول چال کے نام سے دو مستقل رسالے شائع کیے ہیں جنسے الفاظ جدیدہ اور ترکیبات مروجہ حال کا آسانی سے پتہ لگ سکتا ہے۔

ہے۔ اور سوا چار سو صفحوں پر چھپی ہے۔ اس کتاب میں پہلے عربی کے مختصر مفردات ترتیب وار لکھے ہیں۔ جو روزمرہ استعمال میں آتے ہیں۔ پھر ان کے مقابل انگریزی ترجمہ تحریر کیا ہے۔ اسکے بعد مرکبات شروع کئے ہیں۔ اور ہر قسم کے جملے جو روزمرہ استعمال کے متعلق ہیں۔ درج کر دیئے ہیں۔ اس قسم کے ریڈر اور ڈکشنریاں فرانسیسی زبان کے متعلق بھی موجود ہیں۔

عربی فارسی ترکی اور فرانسیسی چار زبانوں کے متعلق مہری آفندی نے ایک کتاب تحفۂ عباسیہ تحریر کی ہے۔ اسمیں چاروں زبانوں کے فقرات ایک دوسرے کے محاذ لکھے ہیں۔ یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی گئی ہے۔ جو شخص چاروں زبانوں میں سے ایک بھی جانتا ہو وہ اسکے ذریعہ باقی زبانیں حاصل کرسکتا ہے

تالیفات جدیدہ | مصریوں میں تصنیف و تالیف کا شوق روز افزوں ترقی پر ہے۔ ہر سال سیکڑوں کتابیں زبانداني۔ دینیات۔ جغرافیہ۔ تاریخ اور ریاضی کے متعلق شائع ہوتی رہتی ہیں۔ جو کتابیں سررشتۂ تعلیم کی زیر نگرانی سرکاری مدارس کے واسطے تیار کرائی جاتی ہیں وہ بہت تنقیح سے لکھی جاتی ہیں۔ اور بلاحظہ کمیٹی علماء کے بعد مصنفین کو نقد انعام دیکر حق تالیف خرید لیا جاتا ہے۔ مگر جو کتابیں پبلک کی طرف سے بطور خود شائع ہوتی ہیں اُنمیں عمدہ کمتر اور حشرات الارض بکثرت ہوتی ہیں۔ چند چیدہ کتابوں کے نام ذیل میں درج ہیں۔

(۱) الدروس النحویہ۔ یہ کتاب پرائمری کی جماعتوں سے لے کر انٹرنس کلاس تک پڑھائی جاتی ہے۔ اسکے چار حصے ہیں اور ہر حصہ میں صرف و نحو کے مضامین تدریجی طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان کے عربی مدرسوں کے واسطے

بہت مفید ہے۔

(۲) النخبۃ الازہریہ۔ یہ کتاب فن جغرافیہ میں ہے۔ اس میں ملک مصر کے حالات تفصیلی طور پر اور دُنیا کے حالات اجمالی طریق پر درج ہیں۔ چند مقامات پر نقشہ جات بھی شامل ہیں۔ جو صحت اور صفائی میں یورپ کے چھاپہ شدہ نقشوں کے ہم پلہ ہیں۔

(۳) خلاصۃ تاریخ عرب۔ یہ کتاب فرانس کے ایک نامور عالم مسیو سیدیو کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ جو علی پاشا مبارک کے اہتمام سے ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہے۔ اور دنیائے اسلام کی ملکی اور علمی ترقیات کا ایک روشن آئینہ ہے۔

(۴) خطط توفیقیہ۔ یہ کتاب سرزمین مصر کے تاریخی اور جغرافی حالات میں علی پاشا مبارک کی تحقیقات کا نتیجہ ہے۔ اور چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

(۵) رحلۃ فکری۔ یہ سفر نامہ امین پاشا فکری کی تالیف ہے جو اُنھوں نے سویڈن اور نٹیل کانفرنس سے واپس آنے پر لکھا تھا۔ پاشائے موصوف نے سفر کے حالات جس عمدگی سے قلم بند کئے ہیں اُس سے اُنکی اعلیٰ لیاقت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے

(۶) الرّق فی الاسلام۔ اصل کتاب احمد زکی بک نے غلامی کے مسئلہ پر فرانسیسی زبان میں لکھی ہے اور یہ اسکا عربی ترجمہ ہے۔ مضمون زیر بحث پر جس خوبی سے خامہ فرسائی ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے نئے تعلیم یافتوں میں وسعت خیالی نے کس قدر ترقی کی ہے۔

(۷) کتاب التوحید۔ اس کتاب میں توحید رسالت معاد اور جملہ اعتقادی مسائل بغیر آمیزش علم کلام نہایت محققانہ طور سے لکھے گئے ہیں۔ اور صرف یہی

مسائل درج کیئے ہیں جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانہ میں اصول اسلام سمجھے جاتے تھے - اسکے مصنف شیخ محمد عبدہ ہیں جو تبحر معلومات اور وسعت خیالات میں اس وقت فرید عصر مانے گئے ہیں - شیخ باوجودیکہ عدالت اپیل کے جج ہیں مگر پھر بھی علمی شوق کے باعث ایک گھنٹہ روز مغرب کے بعد جامع ازہر میں اس کا درس دیتے ہیں - مجھے بھی کئی مرتبہ ان کے درس سے مستفید ہونے کا موقعہ ملا ہے -

(۸) اشہر مشاہیر الاسلام - اس کتاب میں خلفائے راشدین اور انکے نامور سپہ سالاروں کی ملکی فتوحات اور ان کی زندگی کے حالات درج ہیں اور ہر خلیفہ کے حالات ایک علحدہ جلد میں لکھے ہیں - میرے سامنے یہ کتاب چھپنی شروع ہو گئی تھی - اسکے نامور فاضل رفیق بک العظم نے تاریخی واقعات کی چھان بین اور ان کے اسباب دریافت کرنے میں بڑی کوشش کی ہے -

شرکت طبع الکتب العربیہ | یہ کمپنی عربی کی عمدہ اور قدیم کتابیں چھاپنے کے واسطے حال میں قائم ہوئی ہے اور کل حصہ دار مصری مسلمان ہیں - بالفعل مفصلہ ذیل کتابوں کا چھاپنا تجویز ہوا ہے -

۱ - کتاب الوجیز فی فقہ الشافعی - تالیف امام غزالی -

۲ - کتاب سیرۃ صلاح الدین الایوبی - تالیف قاضی ابن شداد -

۳ - الطرق الحکمیہ فی السیاستہ الشرعیہ - تالیف ابن قیم -

۴ - کتاب الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ - تالیف ابن طباطبا -

۵۔ کتاب ایثار الحق عن الخلق۔ تالیف سید محمد مرتضیٰ الحسینی۔

۶۔ کتاب تاریخ دولت آل سلجوق۔ تالیف عماد الدین الاصفہانی۔

۷۔ فتوح البلدان۔ تالیف احمد بن یحییٰ البلاذری۔

کتب خانہ خدیویہ مشرقی علوم کا جو ذخیرہ اس کتب خانہ میں فراہم ہے اُسکی بدولت مصر اور اس کا دارالامارۃ قاہرہ اسلامی دُنیا کے علاوہ یورپین بھی ایک خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لغت۔ ادب۔ تاریخ۔ ریاضی طب۔ حکمت۔ فلسفہ۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ عقائد۔ اور تصوف وغیرہ مختلف علوم و فنون کی ایسی بے نظیر و نایاب قلمی کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں۔ جو مسلمان مصنفوں کی اعلیٰ قابلیت کی یادگار مانی جاتی ہیں۔ علمائے اندلس کی تصانیف جو اس وقت دنیا میں ناپید ہو رہی ہیں۔ اُنکا پتہ بھی کم و بیش اسی کتب خانہ سے چلتا ہے۔ جس میں اس وقت ۳۰ ہزار کتابیں موجود ہیں۔ اکثر ان میں سے بہت پرانی اور قدیم زمانے کی لکھی ہوئی ہیں جو ان مختلف خاندان کے امراؤ سلاطین کی علمی توجہ یاد دلاتی ہیں جنھوں نے تیرہ سو برس تک ملک مصر میں فرمانروائی کی ہے۔ کتابوں کے علاوہ قرآن شریف کے بہت سے مطلاّ و منقش اور اعلیٰ درجہ کے خوشخط نسخے موجود ہیں۔ جنکی زیارت سے آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ ایک کلام مجید تو آثار قدیمہ و یادگار عظیمہ کا حکم رکھتا ہے۔ اور اسکی نسبت کہا جاتا ہے کہ ہرن کی کھال پر امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

گذشتہ صدی تک یہ کتابیں قاہرہ۔ اسکندریہ۔ اسیوط اور دیگر مقامات

مشہور و غیر مشہور کی مسجدوں کے طاق اور صندوقوں میں تھیں۔ جنکی نگرانی عموماً مسجدوں کے امام کیا کرتے تھے۔ مگر یوروپین سیاحوں کے علمی ذوق نے جب محافظین کی جیبیں پُر کر کے کتابوں کو یورپ کا رستہ دکھانا شروع کیا۔ اور کچھ بے احتیاطی سے تلف ہونی شروع ہوئیں تو بعض اہل دل کو درد آیا۔ آخر سر رشتہ تعلیم مصر کے ڈائرکٹر علی پاشا مبارک نے ایک رپورٹ گورنمنٹ میں پیش کر کے انکی حفاظت پر توجہ دلائی۔ اور مصر کے علاوہ تمام اسلامی دنیا کو اپنا ممنون بنایا۔ اس رپورٹ پر یہ سب کتابیں قاہرہ میں فراہم ہو کر بحفاظت رکھی اور ترتیب وار لگائی گئیں۔ اور اس مجموعہ کا نام کتب خانہ خدیویہ قرار پایا جامع ازہر میں جو کتب خانہ پہلے سے موجود تھا وہ ازہر کی عظمت اور شہرت کے باعث بدستور وہیں قائم رہنے دیا گیا۔ کتب خانہ خدیویہ کی فہرست کئی سال کی بڑی محنت سے مرتب ہو کر آٹھ جلدوں میں چھپوائی گئی ہے اور بغرض رفاہِ عام ارزاں قیمت پر فروخت ہوتی ہے۔ خرید کتب قدیمہ کا سلسلہ برابر جاری ہے چند سال میں جب بہت سی کتابیں جمع ہو جاتی ہیں تو ایک علحدہ فہرست بطور ضمیمہ مشتہر کیجاتی ہے۔ اب اس کتب خانہ میں قلمی کتابوں کے علاوہ چھاپے کی کتابیں بھی رکھی جاتی ہیں۔ فارسی۔ ترکی۔ فرانسیسی اور انگریزی کتابوں کی فہرستیں بھی تیار کی گئی ہیں۔

یہ کتب خانہ علاوہ دیگر فوائد کے قدیمی کتابوں کی اشاعت کا بڑا منبع اور ذریعہ ہے۔ مصری تاجر یہاں سے عمدہ عمدہ اور نایاب کتابیں نقل کر کے چھپواتے رہتے ہیں۔ یورپ کے لوگ بھی وقتاً فوقتاً تاریخ اور ادب کی بعض

نادر کتابوں کی نقل منگاتے اور اپنے ملک میں شائع کراتے ہیں۔ میرے زمانۂ اقامت میں مفصلہ ذیل چار کتابوں کی نقلیں تمام ہو کر چھپائی شروع ہو گئی تھی۔

(۱) تفسیر طبری۔ جو ابن جریر طبری المتوفی سنہ ۳۱۰ھ کی تصنیف سے تیس جلدوں میں ہے۔

(۲) کتاب الملل والنحل جو ابن حزم ظاہری اندلسی المتوفی سنہ ۴۵۶ھ کی تصنیف اور پانچ جلدوں میں ہے۔ اس کتاب میں مختلف مذاہب کی تحقیقات نہایت محققانہ طور سے کی گئی ہے۔

(۳) المخصص ابن سیدہ اندلسی المتوفی سنہ ۴۵۶ھ کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سترہ جلدوں میں ہے۔ اور فقہ اللغتہ کے طور پر لکھی گئی ہے۔ مثلاً جو الفاظ خلق الانسان کے متعلق ہیں وہ ابتداء سے انتہا تک ایک جگہ درج ہیں۔ اسی طرح حیوانات کے اسماء اور اعضا کو ایک جگہ لکھا ہے۔ پرندوں کے اسماو اعضا کو ایک جگہ اور جہاں ضرورت پیش آئی ہے شواہد بھی درج کئے ہیں۔ یہ کتاب بلحاظ ادبی تحقیقات کے بے نظیر ہے۔ امام ثعلبی کی فقہ اللغتہ جو ہندوستان میں بہت دن سے آچکی ہے بمنزلہ اسکی فہرست کے ہے۔

(۴) مفتاح العلوم علامہ سکاکی المتوفی سنہ ۶۲۶ھ کی تصنیف ہے۔ اسمیں جملہ علوم ادبیہ کا بیان ہے۔ مطوّل جو فن معانی اور بیان کی ایک مشہور کتاب ہے اسکا متن اسی کتاب کے تین مضمونوں کا خلاصہ ہے۔

یہ چاروں کتابیں منجملہ اُن کتابوں کے ہیں جنکی تلاش کرنے سے دُنیا بھر میں

دو تین نسخے بمشکل مل سکیں گے۔

کتب خانہ کی عمارت بڑی عظیم الشان۔ وسیع و دلکشا ہے۔ اسکی دو منزلیں ہیں۔ نیچے کی منزل میں کتابیں ہیں۔ جن پر ایک معزز عہدہ دار بطور محافظ مقرر ہے اوپر کی منزل میں کتب خانہ کا سپرنٹنڈنٹ۔ اسکا نائب اور دفتر کے لوگ رہتے ہیں۔ اور اسی منزل میں ایک خاص جگہ کتابوں کے نقل کرنے کے لئے مخصوص ہے۔ اس وقت کتب خانہ کا سپرنٹنڈنٹ ایک شخص جرمنی کا رہنے والا ہے جو عربی اور انگریزی میں فی الجملہ مہارت رکھتا ہے۔ اُسکے ماتحت عہدہ دار مصر کے مسلمان عالم ہیں۔

فہرست کتب و مصنفین بڑے بڑے کتب فروشوں کے پاس اپنی اپنی کتابوں کی مطبوعہ فہرستیں موجود ہیں۔ لیکن اُن سے مصنفوں کے نام اور کتابوں کی اصلیت معلوم نہیں ہوسکتی۔ اسی ضرورت کو مدنظر رکھکر امریکہ کے ایک مشہور عالم ڈاکٹر فانڈیک نے تمام دنیا کی مطبوعہ کتب عربیہ کی ایک فہرست گذشتہ سال شائع کی ہے۔ اسکا نام اکتفاء القنوع بما ہو من المطبوع ہے۔ اور قریباً سات سو صفحوں پر چھپی ہے۔ تونس۔ مصر۔ شام۔ قسطنطنیہ۔ پیرس۔ لندن۔ جرمنی۔ ہندوستان اور ایران میں جتنی کتابیں عربی زبان کے متعلق شائع ہوئیں اور جہاں تک مولف کو پتہ مل سکا ہے ان کے نام مع اسمائے مصنفین لکھے ہیں۔ اور ہر فن کی کتابیں صیغہ وار علحدہ علحدہ درج کی ہیں۔

اس فہرست سے پرانی کتابوں کے چھپنے کا حال دریافت ہونے کے علاوہ ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ انیسویں صدی میں جتنے مشہور علماء مصر و شام

واستنبول وغیرہ میں عربی زبان کے مصنف گذرے ہیں۔ اُن کے اور اُنکی کتابوں کے حالات کا خوب پتہ چلتا ہے۔ مسٹر فاندیک نے ان علمار کو تین جماعتوں پر تقسیم کیا ہے۔

جماعت اول میں وہ علمائے کبار ہیں جو عربی کے علاوہ مغربی زبانوں مثلاً انگریزی۔ فرانسیسی اور جرمنی سے بھی واقف تھے۔ اس گروہ میں احمد آفندی فارس ایڈیٹر الجوائب ایک نامور رکن مانے گئے ہیں۔

گروہِ دوم میں اُن علما کے نام ہیں جو عربی کے سوا کوئی اور مغربی زبان نہیں جانتے تھے۔ ان میں ہندوستان کے مشہور و معروف فضلا جناب مولوی عبدالحی لکھنوی مرحوم و نواب صدیق حسن خان صاحب مغفور کے نام بھی درج ہیں۔

تیسرے درجہ میں عام مصنفین کا احوال مندرج ہے۔ جس طرح ہندوستان میں مصنفوں کو آزادی ہے کہ علما کے علاوہ ہر شخص جو کچھ غلط صحیح چاہے لکھکر چھپوا دے۔ یہی کیفیت مصر و شام میں تیسرے درجہ کے بعض علما کی ہے۔ اس فہرست سے مستند اور غیر مستند تصانیف علوم جدیدہ و قدیمہ کا بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے۔

اخبارات

مصریوں نے علمی امور میں جہاں اَور ترقیاں کی ہیں وہاں فن اخبار نویسی کو بھی اعلیٰ درجہ پر پہونچا دیا ہے۔ ملکی۔ مذہبی۔ تمدنی۔ تاریخی۔ اخلاقی امور پر ایسی لیاقت سے مضامین لکھتے ہیں کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ گورنمنٹ کی کارروائیوں اور رعایا کی ضرورتوں پر نہایت آزادی سے رائے زنی کرتے ہیں۔ اور پبلک کے حقوق و فوائد پر گورنمنٹ کو بڑے زور سے توجہ دلاتے ہیں۔ کچھ شبہ نہیں کہ گورنمنٹ مصر اخبارات کو پوری آزادی عطا کرنیکے متعلق بڑی تعریف کی مستحق ہے۔

عامہ خلائق میں اخبار بینی کا مذاق اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ معمولی قابلیت کے لوگ بھی اخبار کا مطالعہ ضروری سمجھتے ہیں۔ قریباً سب دوکاندار اخبار خریدتے ہیں۔ متوسط اور ادنیٰ درجہ کے جتنے قہوہ خانے ہیں اُن سب میں ہر وقت تین چار تازہ اخباروں کی دو دو کاپیاں میز پر پڑی رہتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو قہوہ خانوں میں آنے کی خاص ترغیب ہو۔ امرا کی قدردانی اس حد تک پہونچ گئی ہے کہ کسی گھر کے جتنے زیادہ آدمی لکھے پڑھے ہوں اُتنے ہی زیادہ پرچے وہاں آتے ہیں۔ چنانچہ جب مَیں استنبول و شام کے سفر سے واپس پھر کر فواد بک سلیم نامی ایک مصری رئیس زادہ سے ملنے گیا تو اُنھوں نے اُس دن کے اخبار اللّوا کا ایک تازہ پرچہ مجھے دیا جسکی طبلق ابھی بند تھی۔ میں نے چاہا کہ پہلے وہ دیکھ لیں اور پھر مجھے عنایت کریں۔ مگر اُن کے بیان سے معلوم ہوا کہ اُن کے اور اُن کے والد ہز ایکسیلنسی لطیف سلیم پاشا کے نام علحدہ علحدہ پرچے آتے ہیں۔ یہ پرچہ زائد ہے جو صرف بنظر امداد کارخانہ خریدا جاتا ہے۔

اس وقت خاص قاہرہ میں روزانہ۔ ہفتہ میں دوبار اور ہفتہ وار اخبارات اور پندرہ روزہ رسالے ملاکر پچاس کے قریب پرچے نکلتے ہیں۔ مگر میں ذیل میں صرف اُن اخباروں اور رسالوں کا ذکر کرونگا جنکے مطالعہ کا مجھے موقع ملا اور جنکے اڈیٹروں سے ملاقات کا اتفاق ہوتا رہا۔ اُنکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) المؤید۔ یہ اخبار مصری روزانہ اخبارات میں سب سے بڑا شاندار۔ باوقعت اور آزادنگار مانا جاتا ہے۔ اور شیخ علی یوسف صاحب کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے اس میں ملک مصر اور مسلمانوں کی ضروریات پر نہایت پُرزور اور مدبّرانہ آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ اور یہ جنرل مضامین تو اکثر شیخ موصوف کے قلم سے نکلے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن فرانسیسی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے مسعود آفندی اور انگریزی اخباروں کے ترجمہ کے واسطے حافظ عوض آفندی انکے دو لائق مددگار ہیں۔ یہ حافظ آفندی ہی کی توجہ و قابلیت کا نتیجہ ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کے قومی و مذہبی کوائف اور مختلف جلسوں کے حالات جو یہاں کے انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں اکثر ترجمہ کے ذریعہ مصریوں کے مطالعہ میں آتے رہتے ہیں۔ یوں تو قدرت نے شیخ علی یوسف کے دماغ کو اخبار نویسی کے ساتھ پہلے ہی سے ایک خاص مناسبت رکھی تھی۔ مگر شام۔ استنبول۔ فرانس اور لندن کے سفروں سے ان کے خیالات میں بہت کچھ وسعت و روشنی پیدا ہوگئی ہے۔ اگر یہ شخص یورپ کی کسی زبان میں ید طولیٰ رکھتا تو ضرور اِسے مشرقی دنیا میں یورپ کے مشہور اخبار نویسوں کا مساوی درجہ ملتا۔ اس اخبار کی آزادی رفتار سے ایک زمانہ میں سلطان المعظم کسی قدر کبیدہ خاطر ہوگئے تھے اور بلاد ترکی میں اسکا داخل ہونا بند کردیا تھا

مگر آخرکار اسکی صداقت و راستبازی اور وقعت و احترام کو دیکھکر پھر داخلہ کی اجازت دیدی - اور شیخ کو سلطانی تمغہ بھی عطا کیا - اس اخبار کی روزانہ اشاعت آٹھ ہزار ہے اور سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپیہ ہے -

(۲) اللواء - اسکے مالک اور اڈیٹر مصطفے بک کامل ہیں جو کچھ عرصہ پیشتر مصریوں کے حقوق کی تائید کے واسطے ہر سال موسم گرما میں وائنا - برلن اور پیرس جاتے رہتے تھے اور فرانسیسی زبان میں دھواندھار لکچر دیا کرتے تھے - اس زمانے میں انکی تقریریں اور مضامین اخبار المؤید میں شائع ہوتے تھے اور مصر میں بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے - اس طرح مصطفے بک کو بڑی شہرت و عزت نصیب ہوئی - جسکے بل پر جنوری ۱۹۰۰ء سے انہوں نے اپنا روزانہ پرچہ اللواء کے نام سے الگ جاری کر دیا - انکی طرح انکا اخبار بھی اسلام کی ترقی مسلمانوں کی بہبودی اور بالخصوص مصر کی آزادی کا طالب ہے - اس کی سالانہ قیمت دو پونڈ یا تیس روپے ہے -

(۳) المقطم - اس اخبار کے مالک اور اڈیٹر دو شخص ڈاکٹر صروف اور یعقوب آفندی ہیں - جو شام کے رہنے والے اور قدمائے نصاریٰ کی نسل سے ہیں - عربی انکی مادری زبان ہے - انگریزی اور فرانسیسی زبانیں بیروت کے مدرسہ کلیہ (کالج) سے حاصل کی ہیں - اخبار نویسی میں انکی قابلیت مسلم ہے - مگر المقطم کی پالیسی انگریزی قبضۂ مصر کی تائید کے لحاظ سے اہل مصر کے نزدیک عموماً مسلمانوں کے خلاف اور خصوصاً مصریوں کے ملکی حقوق سے متجاوز ہوتی ہے اسی وجہ سے مصری مسلمان اس اخبار سے متنفر ہیں - اس کی قیمت قریباً ۱/۲ ۲ پونڈ

یا ؏؏ سالانہ ہے۔

علمی رسالوں میں سب سے زیادہ مشہور المنار۔ الہلال المقتطف ہیں پہلا رسالہ سید محمد رشید رضا آفندی طرابلسی کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ سید رشید کو علوم ادبیہ اور دینیہ میں خاص مہارت ہے۔ ان کے مضامین بہت محققانہ اور روشن خیال محدثین کے مسلک پر ہوتے ہیں۔ جنمیں اسلامی مسائل اور عقل سلیم کی مطابقت کا بیان نہایت عمدگی اور خوبی سے ذہن نشین ہوتا ہے اسکی قیمت ہندوستانیوں کے واسطے ۱۶ شلنگ یا بارہ روپے ہے۔

دوسرا رسالہ شام کے ایک عیسائی فاضل جرجی زیدان کے اہتمام سے شائع ہوتا ہے۔ اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ عربی خوانوں میں بھی کسی قدر ہر دلعزیزی حاصل کرچکا ہے۔ جرجی زیدان کو عربی کے سوا انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں اچھی واقفیت ہے۔ اور مسلمانوں کی تاریخ اور علم ادب سے خاص دلچسپی ہے۔ مضامین بڑی تحقیقات سے درج کئے جاتے ہیں۔ اور شروع میں کسی مشہور شخص کی مختصر بالتصویر سوانح عمری ہوتی ہے۔

تیسرا رسالہ اخبار المقطم کے دفتر سے نکلتا ہے۔ اسکے ایڈیٹر ڈاکٹر صروف اور یعقوب آفندی ہر قسم کے عمدہ عمدہ مضامین اس رسالہ میں درج کرتے ہیں اس رسالہ کو ایک قسم کا علمی میگزین کہنا چاہئے۔ مگر افسوس کہ ہندوستان کے بہت تھوڑے آدمی اسکے نام سے شناسا ہوں گے۔

ان فاضل اور عالی خیال اخبار نویسوں کا ذکر ختم کرنے سے پیشتر اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح تعرف الاشیاء باضدادھا کے موافق

روشنی تاریکی سے اور نیکی بدی کے وجود سے پہچانی جاتی ہے۔ اسی طرح مصر میں مفسد اور دریدہ دہن اخبار نویسوں کی موجودگی مندرجہ بالا اخباروں کی عظمت بڑھاتی ہے۔ چنانچہ مصر کی ایک مفسد پارٹی نے ایک اخبار صرف اسی غرض سے جاری کر رکھا ہے۔ کہ اس میں سلطان المعظم اور خدیو مصر کے برخلاف مضمون شائع کئے جائیں۔ عدالت کی جوابدہی کے واسطے ایک نوجوان احمد فواد کو پھانس رکھا ہے۔ جو اس کا ایڈیٹر کہلاتا ہے۔ یہ نوجوان اگرچہ معمولی خط لکھنے سے بھی خام بتایا جاتا ہے۔ مگر خدیو کے برخلاف اس نے ایک زبردست قصیدہ ایک مجلس میں پڑھا۔ اور اپنی اس ناشائستہ حرکت کی پاداش میں چھ مہینے تک جیل خانہ کی ہوا کھائی۔ جج نے دوران مقدمہ میں ہر چند پوچھا کہ یہ قصیدہ کس کا لکھا ہوا ہے۔ مگر احمد فواد برابر یہی کہتا رہا کہ حضور میرا ہے۔ میں نے ایک قہوہ خانہ میں دو ایک ملاقاتوں کے بعد اس سے پوچھا کہ لوگ تمہارے اخبار کے مضمونوں کی نسبت کیوں بدگمانی رکھتے ہیں۔ اور کس وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ تو کہنے لگا کہ یہ ملک کی ناقدردانی و بے انصافی ہے کہ مجھ جیسے قومی خدمتگذار کی لیاقتوں سے اس طرح انحراف کرتے ہیں۔

مصر کا ملکی انتظام

موجودہ حکومت کی مختصر کیفیت

مصر دولت علیہ عثمانیہ کا ایک قدیم صوبہ ہے اور اس کا مقررہ خراج سال بسال سلطان المعظم کی خدمت میں جاتا رہتا ہے۔ پہلے دیگر ترکی صوبجات کی مانند مصر کے لئے بھی ایک والی (گورنر) قسطنطنیہ سے مقرر ہو کر آتا تھا اور اپنی میعاد مقررہ تک یہاں حکومت کرتا تھا۔ مگر ۱۸۰۶ء میں جب محمد علی پاشا گورنر مقرر ہو کر آیا تو اس نے اپنی حسن تدبیر اور زور بازو سے پانچ برس میں اہل مصر کو رام کر کے جرار سپاہ تیار کی اور سامان امارت درست کرنے کے بعد خود مختاری کا دم بھرنے لگا۔ دولت عثمانیہ کی جانب سے اسکی تادیب میں جو کوششیں ہوئیں وہ کامیاب نہ نکلیں۔ محمد علی کا زور دن بدن بڑھنے لگا اور سلطان محمود ثانی کے عہد حکومت ۱۸۰۹ء ۱۲۲۴ھ سے ۱۸۳۹ء ۱۲۵۵ھ میں اُسے ٹرکی کے مقابلہ پر متواتر کامیابیاں میسر آئیں۔ اس نے دمشق و حلب پر قابض ہو کر ترکی جرنیل کو قونیا میں گرفتار کر لیا ان فتوحات سے اسکا رعب قائم ہوگیا۔ اور اندیشہ کیا جانے لگا کہ کہیں کسی دن قسطنطنیہ بھی محمد علی پاشا کے تصرف میں نہ آجائے۔ چونکہ دول یورپ کو اپنی طاقتوں کے موازنہ میں فرق آجانے کا خوف تھا اس لئے لندن میں ایک کونسل معاملات مصر پر غور کرنے کے لئے بیٹھی جسمیں تمام دولتوں کے قائم مقام شریک ہوئے۔ اُسکی قرارداد کے موافق سلطان عبدالمجید سے ایک معاہدہ ۱۸۴۱ء میں لکھوایا گیا جسکی رو سے مصر کی مستقل گورنری محمد علی پاشا کے خاندان میں موروثی قرار پا گئی۔ ٹرکی کا اثر و اقتدار بدستور قائم رہا۔ اور ان کا خطاب

پہلے کی طرح والی قرار پایا۔ سلطان عبدالعزیز کے عہد میں (سنہ ۱۸۶۶ء) اسمعیل پاشا نے زر کثیر صرف[۱] کرنے کے بعد "خدیو" کا خطاب ترکی گورنمنٹ سے حاصل کیا۔ جو قلمرو عثمانیہ میں سلطان کے بعد سب سے زیادہ معزز مانا جاتا ہے۔ اگرچہ اسمعیل پاشا کی یہ خواہش تھی کہ اس کو عزیز مصر کا لقب ملے۔ مگر یہ لقب چونکہ سلطان عبدالعزیز کے نام کا ایک جزو ہونے کے باعث گونہ شرکت رکھتا تھا، اسلئے اسمعیل پاشا کی یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔ اسمعیل پاشا کے زمانہ میں مصر کو جو ترقیاں نصیب ہوئیں انکی بدولت گویا تاریخ مصر میں ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ اس وقت تک والیان مصر کو ملکی نظم ونسق کے انصرام میں باب عالی[۲] کی ہدایتوں کا پابند رہنا پڑتا تھا۔ مگر اسمعیل اول کو خدیو مصر کا لقب عطا ہونے کے ساتھ ہی مالی انتظام کی اصلاحوں۔ فوجوں کے قیام اور غیر سلطنتوں سے تجارتی معاہدے کرنے کے پورے اختیارات بھی مل گئے ڈاکخانوں کا قیام۔ فوجی مدارس کی بنا۔ ریل۔ تار برقی کا اجرا۔ سب اسی پاشا کی قابل قدر یادگار ہیں۔ یہ اختیارات عطا کرنے کے بعد باب عالی نے جو حقوق اپنے لئے محفوظ رکھے انکی مختصر کیفیت حسب ذیل ہے۔

(۱) مصر کا ٹیکس سلطان کے نام سے وصول ہو۔

(۲) بلا اجازت سلطانی خدیو کوئی قرضہ نہ لینے پائے۔

[۱] خدیو کا لقب عطا ہونے سے پیشتر مصر کا خراج ۳ لاکھ ۶۰ ہزار پونڈ تھا۔ مگر اس دن سے ۷ لاکھ ۲۰ ہزار پونڈ مقرر ہو گیا۔

[۲] باب عالی استنبول میں ایک شاہی عمارت ہے۔ جسمیں سلطان المعظم کے وزراء ملکی اور جنگی امور پر غور کرکے انکے نفاذ کی منظوری پیشگاہ حضرت ممدوح سے حاصل کرتے ہیں۔

(۳) گورنمنٹ مصر اگر کوئی علیحدہ سکہ جاری کرے تو اسپر سلطان المعظم کا نام بھی کندہ ہو۔

(۴) گورنمنٹ مصر زمانہ امن وامان میں اٹھارہ ہزار سے زیادہ فوج نہ رکھے

(۵) مصر کے فوجی جھنڈے اور افسران فوج کے نشانات و علامات سلطانی ہوں۔

(۶) مصر کے فوجی افسروں کو امیرالائی (کرنیل) اور ملکی افسروں کو رتبہ ثانیہ سے اعلیٰ کوئی منصب نہ دیا جائے۔

(۷) باب عالی سے اجازت لئے بغیر کوئی آہن پوش جہاز نہ بنوایا جائے۔

(۸) گورنمنٹ مصر کسی غیر قوم کو اپنے ملک کے کسی حصہ میں آباد ہونیکی اجازت نہ دے۔

تنبیہ ۔ شرط نمبر دوم کے قرار پانے کی یہ وجہ تھی کہ اسمعیل پاشا نے دول یورپ سے کثیر المقدار روپیہ قرض لیکر جا و بے جا صرف کر ڈالا تھا۔ جسکے ادا کرنے کا کوئی انتظام نہ ہونے کے باعث سلطان عبدالحمید نے انگلستان و فرانس کے زور دینے پر ۱۸۷۹ء میں اسمعیل پاشا کو معزول کیا۔ اور اسکے بیٹے توفیق پاشا کو جانشین مقرر فرمایا۔

عباس حلمی پاشا موجودہ خدیو اس وقت مصر کے حکمران خدیو عباس حلمی پاشا ہیں جو توفیق پاشا مرحوم کے خلف الرشید اور خاندان محمد علی کے ساتویں فرمانروا ہیں۔ یہ اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۹۲ء میں تخت نشین ہوئے۔ اُنھوں نے اپنا زمانہ طفولیت یورپ میں گذارا اور وہیں آپ نے تعلیم پائی۔ وائنا

کے تعلیمی سٹینم اکیڈیمی میں پانچ سال قیام فرمایا۔ چنانچہ اپنے والد نامدار کی وفات کے وقت بھی آپ وہیں تھے۔ فرنگستانی تعلیم و تربیت کے اثر سے یا نشائے موصوف کو علمی تحقیقات و مفید اختراعات سے واقف ہونے کا بہت کچھ موقع ملا۔ اور خیالات میں روشنی پیدا ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے فرنگستانی سلطنتوں کی حکومت کے طریقے مصر میں جاری کئے اور رعایا کو ملکی انتظام میں حصہ لینے اور سرکاری کارروائیوں کے موافق یا مخالف آواز بلند کرنے کی اجازت دی۔ موجودہ خدیو فصل سرما قاہرہ میں بسر کرتے ہیں اور گرمیوں میں اسکندریہ چلے جاتے ہیں جہاں کی ہوا ساحل بحر کی قربت کے باعث نسبتاً خنک ہے۔ بعض اوقات اسی موسم میں یورپ کی سیر کو چلے جاتے ہیں اور وہاں کی علمی ترقیوں سے خود کو واقف بناتے رہتے ہیں۔ آپ وقتاً فوقتاً ملک میں دورہ بھی کرتے ہیں جو رعایا کے اصلی حالات سے آگاہی حاصل کرنے کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں۔ جمعہ کی نماز مع حشم و خدم باری باری سے مختلف مسجدوں میں ادا کرتے ہیں۔ چونکہ اس کا اعلان کئی روز پہلے ہو جاتا ہے اس لئے لوگ جوش عقیدت و انقیاد سے اُسی مسجد میں جمع ہوتے ہیں۔ آپ کے مصارف کے واسطے ایک لاکھ پونڈ سالانہ یا سوا لاکھ روپیہ ماہوار ہے جسکے مصارف زیادہ تر خیرات و فائدہ رسائی خلائق پر مبنی ہوتے ہیں۔ خور و نوش لباس و دیگر اسباب راحت کے بارہ میں آپ سادگی پسند ہیں۔ اور تکلفات و آرائش سے بالطبع متنفر اکثر سادے کپڑے زیب تن فرماتے ہیں اور بکمال خلوص معمولی آدمیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ جسکو ایک دفعہ بھی آپکی حضوری میں بار ملا عمر بھر کیلئے

گرویدۂ اخلاق بنگیا۔

طرز حکومت خدیو مصر ملک کے اندرونی انتظام میں ہر طرح آزاد و بااختیار ہیں اور یہ آزادی و خود مختاری فرامین سلطانی کے بموجب انہیں حاصل ہوئی ہے۔ مگر خدیو حال نے محض ملک کی ترقی اور رعایا کی بہبودی مدنظر رکھ کے نظام حکومت ان اصولوں پر جاری کیا ہے جو اس وقت یورپ کی مہذب سلطنتوں میں رائج ہیں۔

قوانین و نظامات کے ترتیب دینے اور ان کی تعمیل کرانے کے واسطے جو کمیٹی اسمٰعیل پاشا کے حکم سے مصر میں قائم ہوئی ہے اسکو مجلس النظار کہتے ہیں۔ جس کا مفہوم دوسرے لفظوں میں کیبنٹ (جلسۂ وزرا) ہے۔ صدر مجلس ناظر النظار یا صدر اعظم کہلاتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ مجلس کے پاس شدہ اہم و ضروری معاملات منظوری کے لئے خدیو کے حضور میں پیش کرے۔ اس مجلس میں ملکی ضروریات کے لحاظ سے کئی سب کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ اور ہر کمیٹی کا میر مجلس ناظر کہلاتا ہے۔ ان کمیٹیوں کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ نظارت خارجیہ ۔ وزارت محکمہ خارجیہ۔

۲۔ نظارت داخلیہ ۔ وزارت محکمہ داخلیہ

۳۔ نظارت مالیہ ۔ وزارت محکمہ مال۔

۴۔ نظارت حقانیہ ۔ وزارت عدالت

۵۔ نظارت حربیہ ۔ وزارت محکمہ جنگ

۶۔ نظارت الاشغال ۔ وزارت محکمہ تعمیرات

۷۔ نظارت المعارف۔ وزارت محکمہ تعلیم۔

ان کے سوا ایک کمیٹی "نظارت الاوقاف" نامی ہے۔ جس کا انتظام پہلے مجلس النظار کے ماتحت تھا۔ مگر اب اس کا ایک علحدہ دفتر خدیو معظم کی زیر نگرانی قائم ہے۔ یہ مجلس اُن جائدادوں اور جاگیروں کا انتظام کرتی ہے جو مصر کے نیک دل لوگوں نے مسجدوں۔ تکیوں۔ شفا خانوں اور مدرسوں کی امداد کے لئے باوقات مختلف وقف کی تھیں۔ ان مجالس کے فرائض اسقدر صاف اور واضح ہیں کہ غالباً ہندوستانیوں کو ان کے سمجھنے میں ذرا بھی تامل نہ ہوگا۔ کیونکہ انہی کے قریب قریب گورنمنٹ آف انڈیا میں مختلف انتظامی صیغے قائم ہیں اور اُن کے افسران اعلیٰ بحیثیت رکن مجلس واضع آئین وقوانین ملکی قوانین بنانے میں حصہ لیتے ہیں۔ مگر مصری عدالتوں کے حالات یہاں کی نسبت کسی قدر متفاوت ہیں۔ ان کا مختصر بیان بھی غالباً میرے اہل ملک کے لئے دلچسپ ہوگا۔

عدالتیں مصر میں عدالتوں کا انتظام کسی قدر پیچیدہ واقع ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر قسم کے مالی شخصی اور تجارتی مقدمات صرف محاکم شرعیہ (دینی عدالتوں) میں فیصل ہوا کرتے تھے۔ مگر ۱۸۵۶ء میں جب سے کہ قلمرو عثمانی میں انفصال مقدمات کا نیا انتظام ہوا۔ مصر میں بھی فرمان سلطانی کے مطابق محاکم اہلیہ (ملکی عدالتیں) قائم کئے گئے۔ جن کے اجرا سے یہ مدعا تھا کہ مختلف مذہب والوں کے مقدمات زیادہ آسانی سے فیصل ہو سکیں اس وقت محاکم شرعیہ کے اختیارات صرف امور متعلقۂ نکاح۔ طلاق۔ وراثت

اور رہبہ کے تصفیہ پر محدود ہو گئے۔ اور باقی سب قسم کے مقدمات محاکم اہلیہ میں فیصلہ ہونے لگے۔

محاکم شرعیہ اور اہلیہ کا اثر صرف مصریوں پر تھا۔ ممالک غیر کے باشندے ان کے زیر اثر نہ آتے تھے۔ کیونکہ معاہدات بین الاقوام کے مطابق ان لوگوں کو کچھ ایسے خاص حقوق عطا ہوئے تھے۔ جنہیں بلا منظوری دول یورپ کے کچھ تغیر تبدل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پس ان کے لئے ایک تیسری قسم کے محکمہ کی ضرورت پیش آئی۔ جو ممالک غیر کے قائم مقاموں پر مشتمل ہوں تاکہ غیر ملک کے باشندے اپنے ملکی قوانین کے مطابق اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھ سے داد پاسکیں۔

کچھ عرصہ اس طرح کام چلتا رہا۔ مگر باہر والے مقدمات مرجوعہ کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی تھی۔ نیز یہ لوگ اپنے وسیع حقوق سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر مصریوں کو تکلیف دیتے اور نقصان پہونچاتے تھے۔ اس لئے اسمعیل پاشا نے باہر والوں کی قوت گھٹانے کی خاطر دول یورپ کی منظوری سے محاکم مختلطہ قائم کئے۔ ۱۸۷۵ء میں ان عدالتوں کا آغاز ہوا۔ اور ان کو تمام ایسے ملکی و تجارتی معاملات کے فیصلہ کا اختیار دیا گیا جو ملکی اور غیر ملکی باشندوں کے درمیان یا دو مختلف قوموں کے غیر ملکی باشندوں کے مابین واقع ہوں۔ اس طرح قنصل کے محکموں کا زور گھٹ گیا۔ اور محاکم مختلطہ زور پکڑ گئے۔ المختصر اس وقت مصر میں چار قسم کے محکمے ہیں۔

(۱) محاکم اہلیہ۔ (ملکی عدالتیں) جن میں باشندگان ملک کے ہر قسم کے مقدمات بلا لحاظ مذہب کے فیصل ہوتے ہیں۔

(۲) محاکم شرعیہ (دینی عدالتیں) جن میں صرف مسلمانانِ مصر کے مقدمات متعلق نکاح - مہر - نان ونفقہ - ہبہ - وصیت اور میراث کے فیصل ہوتے ہیں

(۳) محاکم قناصلیہ - (ایلچیوں کی عدالتیں) جن میں ایسے مقدمات کا فیصلہ ہوتا ہے جن کے فریقین ایک ہی بادشاہ کی رعیت ہوں -

(۴) محاکم مختلط جن میں وہ تمام ملکی وتجارتی معاملات فیصلہ ہوتے ہیں جو ملکی اور غیر ملکی باشندوں یا دو مختلف اقوام کے غیر ملکی باشندوں میں واقع ہوں

عدالتوں کی کیفیت مذکورہ بالا محاکم میں سے محاکم شرعیہ ومحاکم اہلیہ کے جج ومجسٹریٹ مصری لوگ ہوتے ہیں - اور اپنی اپنی جگہ پر شریعت اسلامی و قوانین ملکی کے بموجب مقدمات مرجوعہ کا تصفیہ کرتے ہیں - محاکم شرعیہ میں عہدہ پانے کے لئے لازمی ہے کہ امیدوار دینیات کا زبردست عالم اور فقہ واصول فقہ سے پورا باخبر ہو - محاکم اہلیہ کے حاکم ملکی قوانین سے بخوبی ماہر ہوتے ہیں - اور علی العموم ایک درجۂ خاص کا قانونی امتحان پاس کرتے ہیں - ان عہدوں کے لئے ایسے امیدواروں کا استحقاق بالا سمجھا جاتا ہے جو ملک فرانس سے قانونی لیاقت کی سند لے کر آئیں - محاکم قناصلیہ میں مختلف دولتوں کے قنصل ہی ججوں کے اختیارات برتتے ہیں - اور خود ہی اپنی رعایا کے مقدمات فیصل کرتے ہیں - محکمہ مختلط میں مصری اور فرنگستانی دونوں قسم کے جج ہوتے ہیں - اور ہر مقدمہ میں قانون مروجہ یورپ کے موافق بڑی بڑی موشگافیاں کرتے ہیں - محاکم قناصلیہ کی اپیل اسی محکمہ میں ہوتی ہے عظمت اور وقعت کے لحاظ سے یہ محکمہ جملہ محاکم سے فائق ہے - مگر فرنگستانی ججوں کو پوری تنخواہ

اور مصریوں کو اسکا دو ثلث ملتا ہے۔

قنصلوں کی عدالتیں ہمارے ہاں کی رزیڈنسی کورٹوں سے کسیقدر مشابہت رکھتی ہیں۔ اور اپنے فیصلے بہت جلد صادر کرتی ہیں۔ اکثر نالش دائر کرنے کے ہفتہ عشرہ بعد ہی تاریخ پیشی قرار پاجاتی ہے اور عموماً پہلی ہی پیشی میں فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔ یہ طریقہ مسافروں اور سوداگروں کی سہولت و آسائش کے لئے بسا ضروری ہے۔ ورنہ پردیسیوں کو کسی جھگڑے میں پھنسکر بلا قصد مہینوں ٹھہرنا پڑے اور انکا سخت ہرج و نقصان ہو۔ محاکم قنصلیہ کے فیصلے عموماً سخت ہوتے ہیں۔ جنکا ناگوار اثر ملزم یا مدعا علیہ کی جان و مال پر فوراً پڑتا ہے۔ وہاں دوسری عدالتوں کی طرح لمبی چوڑی شہادتیں اور شہادتوں پر موشگافی نہیں ہوتی بلکہ مطلب کی باتیں پوچھی اور دیکھی جاتی ہیں۔ اگر مطالبہ ثابت نہ ہوا تو مقدمہ خارج کر دیا جاتا ہے۔ اور بصورت ثبوت مدعا علیہ کا مال اسباب فوراً نیلام کرا دیا جاتا ہے یا اُسے جیلخانہ بھیجدیا جاتا ہے۔ اکثر اس دباؤ سے روپیہ فی الفور وصول ہو جاتا ہے اور اصل بات کھل جاتی ہے۔ محکمجات قناصل کی کارروائی سے لوگ ہر وقت خائف رہتے ہیں۔ اور حتی الامکان اپنا معاملہ وہاں تک جانے نہیں دیتے کئی مقدمے انگریزی رعایا کے میرے سامنے چند روز میں فیصل ہو گئے۔ جو انگریزی عدالتوں میں مہینوں بلکہ برسوں اُلجھے رہتے۔ اگر کوئی شخص تاریخ پیشی سے پہلے بھاگ جانے کا ارادہ کرتا ہے تو فوراً قنصل اسکا پاسپورٹ بند کر دیتا ہے اور بنادر اسکندریہ و پورٹ سعید پر حکم بھیجدیتا ہے کہ اسے

جہاز میں سوار نہ ہونے دیا جائے۔ جنکو سزائے قید ملتی ہے وہ قنصلوں کی درخواست پر مصر کے جیلخانوں میں رکھے جاتے ہیں۔ جہاں اجنبی مجرمین کے لئے علحدہ وارڈ بنے ہوئے ہیں۔

باقی عدالتوں کی کیفیت وہی ہے جو ہندوستانی عدالتوں میں دیکھی جاتی ہے۔ مقدمہ بڑی سست رفتار سے قدم قدم آگے بڑھتا ہے۔ وکلاء اور بیرسٹر اپنی لیاقتیں خوب بگھارتے ہیں۔ انکی قانونی چھان بین سے مقدمہ مہینوں بلکہ برسوں میں جاکر طے ہوتا ہے۔ جملہ عدالتوں کی کارروائی عربی میں ہوتی ہے۔ اور فیصلے عربی یا فرانسیسی میں لکھے جاتے ہیں۔ وکلاء جنکی خاص کثرت ہے انہی دونوں زبانوں میں تقریر کرتے ہیں۔ لیکن میرے زمانہ قیام میں اس مضمون کا حکم نافذ ہو چکا تھا کہ آئندہ سال سے وکلاء کو انگریزی میں بھی تقریر کرنے کی اجازت ہوگی۔ یہاں کے وکلاء کی فیس نسبتاً ہندوستان سے زیادہ ہوتی ہے اور وہ اپنے موکلوں کے لئے محنت بھی زیادہ کرتے ہیں عدالتوں کی حالت ہندوستان کی کچہریوں سے ملتی جلتی ہے۔ اسٹامپ کورٹ فیس وغیرہ کا چلن یہاں بھی ویسا ہی ہے اور اہلکاروں کی ہمیشہ چاندی رہتی ہے۔

فوجی خدمت کارکنان سلطنت کی یہ رائے ہے کہ ہر بالغ نوجوان کا اصلی فرض اپنے ملک کی حفاظت ہے۔ چنانچہ اس اصول کے موافق تمام لڑکے سن بلوغ پر پہونچنے کے بعد فوجی خدمت ادا کرنے کے لئے مجبور کئے جاتے ہیں۔ فوجی عہدہ دار سال بسال ملک کے تمام حصوں میں ایک وقت معین پر گشت لگاتے ہیں اور رجسٹر پیدائش سے لڑکوں کی عمریں دیکھتے ہیں۔ جو لڑکا بیس برس کی عمر کو پہونچ جائے اور تندرست صحیح المزاج ہو

اُسے فوج میں بھرتی کر لیتے ہیں۔ جس شخص کو کسی عارضۂ جسمانی یا خانگی تعلقات کے باعث فوجی خدمت ناپسند ہو وہ بیس پونڈ (تین سو روپیہ) معاوضہ دے کر اس سے بری ہو جاتا ہے۔ بعض مذہبی پیشواؤں کی اولاد اعزازی طور پر اس خدمت سے مستثنٰی کی گئی ہے۔ جو لڑکا تعلیم میں مشغول ہو وہ ہیڈ ماسٹر کی تصدیق پر ایک زمانۂ معین تک مستثنٰی سمجھا جاتا ہے۔ اور جس نے کسی دینی یا دنیاوی صیغہ کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیا ہو وہ مدۃ العمر کے لئے الگ کر دیا جاتا ہے۔ بعض اہل الرای کا خیال ہے کہ جامع ازہر میں جو طلبا کی اتنی کثرت نظر آتی ہے۔ اُس کی وجہ کسی قدر فوجی خدمت کی سختی سے بھی علاقہ رکھتی ہے۔

فوجی خدمت سے مصر والے جو بے اعتنائی برتتے ہیں وہ ان واقعات سے بخوبی ظاہر ہو سکتی ہے کہ بعض لڑکے انتخاب کے زمانہ میں طرح طرح کی دوائیں استعمال کرتے ہیں جو انہیں کمزور و ناتواں بنا دیں۔ بعض لڑکے اپنے ہاتھ پاؤں زخمی کر لیتے ہیں تاکہ ڈاکٹر انہیں فوجی خدمات کے ناقابل قرار دے۔ جن لڑکوں کی نسبت یہ حرکات خلاف قانون پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہیں اُنکا چالان کیا جاتا ہے۔ اور عدالت سے قید کی سزا ملتی ہے۔ جو لڑکے تحصیل علم یا تجارتی مقاصد کے واسطے مصر کے باہر جانا چاہتے ہیں اُنھیں اپنے کسی وارث یا دوسرے معزز شخص کی ضمانت اس امر کے لئے دلوانی پڑتی ہے۔ کہ وہ انتخاب کے وقت حاضر کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اس ضمانت کے بغیر کسی لڑکے کو جہاز پر سوار ہونے کا پاسپورٹ نہیں مل سکتا۔

جس قدر لڑکے فوجی خدمت کے لئے منتخب ہوتے ہیں ان میں سے تعلیم یافتوں اور غیر تعلیم یافتوں کی الگ الگ جماعتیں بنائی جاتی ہیں اور فوجی تعلیم کا کورس تمام ہونے اور لڑکوں کے امتحانات میں کامیابی حاصل کرنیکے بعد تعلیم یافتوں کو افسری کے عہدے ملتے ہیں۔ اور غیر تعلیم یافتوں کو سپاہیوں کی خدمت انجام دینی پڑتی ہے۔ ہر شخص کو ایک مقررہ تنخواہ ملتی رہتی ہے چار برس کے بعد ان کو اختیار دیا جاتا ہے کہ خواہ فوجی ملازمت جاری رکھیں خواہ اپنے گھر واپس جاکر کسی اور کام میں مصروف ہو جائیں۔

۱۸۸۲ء میں جب اعرابی پاشا کی بغاوت کا خاتمہ ہوا تو مصر کی ساری فوج حسب الحکم توفیق پاشا خدیو مصر برخاست کر دی گئی اور دسمبر سنہ مذکور میں نئی سپاہ کی تکمیل و ترتیب ایک انگریز جرنل کے سپرد کی گئی۔ اور اُسے سردار کا خطاب مرحمت ہوا۔ جو کمانڈرانچیف کا ہم معنی ہے۔

اس وقت مصری فوج میں ۹۰ انگریز افسر موجود ہیں اور سپاہیوں کی تعداد ۱۵۱۵۳ ہے۔ ان انگریز عہدہ داروں کی سخت گیری کی اکثر شکایتیں سنی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں تین ہزار آدمیوں کی ایک خالص فوج اور مصر میں قائم کیگئی ہے۔ جس کے تمام مصارف مصری گورنمنٹ کے ذمہ ہیں۔ اس کو "جیش احتلال" یعنے فوج قابض کہتے ہیں۔ یہ فوج گویا انگریزی قبضہ مصر کی تائید کے لئے متعین اور صرف انگریزی فوائد کی محافظ ہے۔

مصر کے پاس اس وقت کوئی جنگی جہاز نہیں۔ قبل ازیں جو بیڑہ جہازات خدیویہ کے نام سے موجود تھا وہ ایک انگریزی کمپنی کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا۔

ریل انیسویں صدی کے شروع تک مسافروں کی آمد و رفت اور تجارتی مال کی درآمد برآمد زیادہ تر کچی سڑکوں دریائے نیل اور نہروں کے ذریعہ سے ہوا کرتی تھی۔ مگر خدیو اسمعیل پاشا کے زمانہ میں خصوصاً یورپ کے میل ملاپ سے ریل۔ تار اور ڈاک کا سلسلہ تمام ملک میں جاری ہوگیا ہے۔ مصر کی تمام بڑی بڑی ریلوے لائنوں کا صدر مقام قاہرہ ہے۔ شمال کی طرف سویز۔ پورٹ سعید۔ اسکندریہ تک اور جنوبی سمت میں اسیوط سے تھوڑی دور آگے تک اکثر بڑے بڑے شہر اور قصبے بذریعہ ریلوے پایۂ تخت سے مربوط ہیں۔ عموماً اسٹیشن خوشنما اور مستحکم عمارت کے ہیں۔ خصوصاً دارالامارۃ کا اسٹیشن تو وسعت و خوبصورتی میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ ہندوستان کی طرح یہاں بھی پلیٹ فارم کے سامنے سٹیشن کے ہر کمرے کے دروازے پر سٹیشن ماسٹر۔ تار گھر لیگیج آفس۔ ریفرشمنٹ روم وغیرہ مختلف دفتروں اور صیغوں کے سائن بورڈ عربی زبان میں لگے ہوئے ہیں۔

ریل کی گاڑیاں نہایت کشادہ۔ ہوادار۔ صاف و آرام دہ اور انجن بہت تیز رفتار ہوتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی اکثر لائنوں کے خلاف یہاں کوئی انٹر میڈیٹ کلاس (ڈیوڑھا درجہ) نہیں۔ صرف اول۔ دوسرا اور تیسرا درجہ ہوتا ہے ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کی گاڑیوں کے دروازے باہم مقابل و پیوستہ ہیں اس لئے مسافر بحالت رفتار ہر ایک گاڑی سے ساری ٹرین میں بآسانی پھر سکتا ہے۔

سب مصری لائنیں سوائے تین چھوٹی چھوٹی شاخوں کے گورنمنٹ مصر کی ملکیت ہیں۔ صیغہ ریلوے کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہے۔ جس کے

تین ممبر ہیں۔ ایک انگریز جو صدر مجلس ہوتا ہے۔ دوسرا فرانسیسی تیسرا مصری باقی تمام عہدہ دار جو سٹیشنوں اور انجنوں پر کام کرتے ہیں عموماً مصر کے باشندے ہیں لیکن انجن وغیرہ سب چیزیں یورپ سے بن کر آتی ہیں۔ اور گاڑیاں ہندوستان کی طرح یہیں تیار ہوتی ہیں۔

تار برقی مصر کے اکثر حصوں میں تار برقی کا جال بچھا ہوا ہے۔ اور تمام بڑے بڑے شہر اور قصبے جو ریلوے لائن سے فاصلے پر ہیں اُن تک تار کا سلسلہ موجود ہے۔ عریش سے ملک شام تک تار کا ایک جداگانہ سلسلہ ہے جو غزہ اور یافہ میں گذرتا ہوا خشکی کے راستے اسٹنبول تک چلا جاتا ہے۔

بحری تار کا خاص دفتر یورپ سے نامہ و پیام کرنے کے واسطے اسکندریہ میں ہے۔ جس کے تین سلسلے ہیں (۱) اسکندریہ سے براہ برنڈزی۔ (۲) اسکندریہ سے براہِ مالٹا (۳) اسکندریہ سے براہ سائپرس۔

تار کا ایک اور سلسلہ جو بحیرۂ قلزم میں سویز سے عدن تک پڑا ہوا ہے اس کا دفتر سویز میں ہے۔ اندرون ملک میں جانے والے تار برقی پیاموں کی نسبت فرستندہ کو اختیار ہے کہ چاہے تار کا فارم عربی میں لکھے خواہ انگریزی یا فرانسیسی میں تحریر کرے۔ مگر ملک کے باہر جانے والی خبریں ہمیشہ یورپین زبانوں خاصکر فرانسیسی میں لکھ کر دیجاتی ہیں۔

ڈاک ڈاک خانہ کا انتظام اس ملک میں بڑی ترقی پر ہے۔ مصری شہروں اور قصبوں کی ڈاک تو راتدن تقسیم اور روانہ ہوتی رہتی ہے۔ مگر ہندوستان و ممالک غیر کی ڈاک ہفتہ میں ایک بار صرف منگل کے دن آتی اور اسی روز

چلی جاتی ہے۔ منی آرڈر اور پارسلوں کی تقسیم کا انتظام بمقابلہ ہندوستان ذرا سخت ہے۔ جب کسی شخص کے نام کوئی منی آرڈر یا پارسل اس شہر کے ڈاکخانہ میں آتا ہے تو مرسل الیہ کے پاس ایک اطلاع نامہ بھیجا جاتا ہے تاکہ وہ ڈاکخانہ میں حاضر ہو کر خود پارسل یا روپیہ وصول کرے۔ جن لوگوں کو ڈاک خانہ والے جانتے پہچانتے ہیں ان کی دستخطی رسیدوں پر روپیہ اور پارسل ان کے نوکروں کو بھی دیدیتے ہیں۔ لیکن نووارد اور غیر مشہور آدمی کو اپنی شناسائی کی معتبر شہادت یا کسی معزز آدمی کی تحریری تصدیق بدیں مضمون پیش کرنی ہوتی ہے۔ کہ سائل ہی اس کا مستحق ہے۔ اگرچہ مسافروں کو اس میں ایک گونہ تکلیف ہوتی ہے مگر منی آرڈر اور پارسلوں کی تقسیم میں کسی دغابازی کا احتمال باقی نہیں رہتا۔

جو پارسل غیر ملکوں سے آتے ہیں۔ ان کا محصول پورٹ سعید میں تجویز کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے پارسل اکثر آتے رہتے ہیں اُن کے پارسلوں کا محصول قیمت مندرجہ پارسل کے مطابق لگایا جاتا ہے۔ لیکن جب کسی نئے شخص کا پارسل آئے یا کسی پارسل کی نسبت کچھ شک پڑ جائے تو اُسے کھول کر مال دیکھ لیا جاتا ہے۔ اور اسکی قیمت مقررہ و موجودہ نرخ ناموں کے مطابق تجویز کی جاتی ہے۔ پارسل کھولتے وقت ایک معزز عہدہ دار موجود رہتا ہے۔ تاکہ کسی قسم کی خیانت نہ ہونے پائے۔ میرے ایام اقامت میں کئی درجن پارسل میرے نام ہندوستان سے آئے جنمیں سے بعض پورٹ سعید میں کھولکر دیکھے بھی گئے۔ مگر کسی میں نقصان نہیں ہوا۔ ویلیو پی ایبل رسال کا طریق یہاں رائج نہیں۔ پارسلوں کا بیمہ یہاں بھی کرایا جاسکتا ہے۔ اور رجسٹری بھی روانہ ہوسکتی ہے۔ سیونگ بنک بھی کھلے ہوئے ہیں۔ جنکے قواعد ہندوستان سے ملتے جلتے ہیں۔

قرضۂ مصر اسمٰعیل پاشا نے پیشگاہ سلطانی سے خدیو کا لقب حاصل کرنیکے بعد اپنے اختیارات سے جو کچھ تجاوز کیا اس کی سب سے بڑی ناگوار یادگار فرنگستانی سلطنتوں کے قرضہ کی صورت میں قائم ہوئی جس نے مصر کی حالت میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا۔ اس قرضہ کی مقدار ابتدا میں ۳۰ لاکھ پونڈ تھی۔ مگر پاشائے مذکور کے زمانہ میں ساڑھے دس کروڑ پونڈ تک پہونچگئی۔ اسمیں سے کچھ روپیہ تو اسمٰعیل پاشا نے سامان تعیش وانبساط پر اُٹھایا۔ اور بڑا حصہ عمارات قاہرہ کی درستی۔ سڑکوں کی تعمیر۔ راستوں کی صفائی اور باغوں کی آراستگی میں صرف کیا۔ ایسے کاموں پر بہت کم رقم لگائی جنسے کچھ آمدنی متصور ہوتی۔ اس پر غضب یہ کیا کہ اصل چھوڑ سود کے ادا کرنے میں بھی لاپروائی برتی قرضخواہوں کو مجبوراً اپنی اپنی گورنمنٹوں سے فریاد کرنی پڑی۔ چونکہ قرض کا بڑا حصہ فرانس وانگلستان کے متحدہ سرمایہ پر مشتمل تھا۔ اس لئے دونوں سلطنتوں نے سلطان عبدالحمید پر زور ڈالکر ۱۸۷۹ء میں اسمٰعیل پاشا کو معزول کرایا۔ اور پاشائے جدید کو اختیارات حکومت دلانے کے ساتھ ہی ادائے قرضہ کے واسطے تین محکمے الگ الگ قائم کرائے جنکی تحویل میں ملک کی آمدنی کے خاص خاص حصے دئے گئے۔ محکموں کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) صندوق الدین۔ قرضہ کا سود ادا کرنا اس محکمے کے فرائض میں داخل ہے جسکے لئے چند اضلاع کی آمدنی اُسکے اختیار میں دے دیگئی ہے۔

(۲) دائرہ سنیہ۔ اس محکمہ کے ماتحت بھی چند اضلاع ہیں جن کے محاصل سے اصل قرضہ کی ادائگی میں قسطیں دیجاتی ہیں۔

(۳) قومسیون الاراضی المیریہ۔ اس محکمہ سے اُن جاگیروں کا انتظام متعلق ہے،

جو اسمعیل پاشا نے ملک کی مالی حالت درست ہونے کی غرض سے گورنمنٹ مصر کے حوالہ کی تھیں۔ اِن تینوں محکموں کا انتظام دول یورپ کی زیرنگرانی رکھا گیا۔ اور مجلس قانونی کے مصری ممبر بھی اس میں شریک ہوئے۔

انگریزی قبضہ اسمعیل پاشا نے دول یورپ سے جو کثیر المقدار قرضہ لیا تھا۔ اس کا ناگوار اثر صرف پاشائے موصوف کی معزولی پر محدود نہ رہا۔ بلکہ اس نے رفتہ رفتہ مصر کے ملکی و انتظامی معاملات میں بے انتہا پیچیدگیاں پیدا کر دیں۔ مصر کی خود مختاری کو سخت صدمہ پہونچایا۔ اور کچھ عرصہ بعد غیر سلطنتوں کو معاملات مصر میں دخیل کر دیا۔ ادائے سود و زر اصل کے متعلق جو مندرجہ بالا محکمے قائم ہوئے تھے انکی نگرانی میں اول اول انگریزوں اور فرانسیسیوں کا دخل بحصہ رسدی تھا۔ اور دوسری طاقتوں کے قائم مقام اور خاص دولت مصر کے افسر بھی اسمیں پورے اختیارات سے شریک تھے۔ مگر اعرابی پاشا کی بغاوت واقع ۱۸۸۲ء کے موقع پر فرانسیسیوں نے اپنی ذمہ داری سے دم چرایا اور انگریزوں پر سارا بار ڈالدیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا چاہئے تھا کہ فرانسیسیوں کا زور گھٹ گیا۔ اور قریباً تمام کاموں پر انگریز متصرف ہو گئے۔ انگریزی نگرانی کہنے کو تو صرف مالی نگرانی ہے۔ مگر عملی طور پر ہر محکمہ کے انتظام میں انگریز دخیل ہیں۔ ہر تجویز میں یہ شریک ہوتے ہیں۔ ہر کارروائی کی نگرانی کرتے ہیں۔ فوجی معاملات ان کے زیر اثر ہیں۔ خزانہ شاہی پر ان کا اقتدار ہے۔ غرض سلطنت کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں انکا پورا پورا دخل نہ ہو۔ بارہا حکام مصر اور برٹش ایجنٹ میں بدمزگیاں پیدا ہوئیں۔ ان کے اہلکاروں کی بے جا زیادتی اور ناجائز مداخلت

کی شکایتیں گذریں۔ فرانس و امریکہ کے اخبارات نے دول یورپ کو تخلیۂ مصر کے متعلق اکسایا۔ مصر کے پریس نے داد چاہی۔ مصری حُبّ وطن یورپین سلطنتوں کے وزراء سے جاکر ملے۔ سلطان المعظم نے کئی مرتبہ برٹش گورنمنٹ کو توجہ دلائی۔ مگر انگریزی اثر کی حالت "ہمانست کہ بود" کی مصداق بلکہ رو بہ ترقی رہی۔

خیر مصریوں کے انگریزی قبضہ کی نسبت خواہ کیسے ہی خیالات ہوں لیکن انگریزوں کے آنے سے ملک کی حالت میں جو تبدیلی واقع ہوئی ہے اسکا اثر ایک سیاح کی طبیعت پر اس اعتبار سے بہت مسرّت انگیز پڑتا ہے کہ انتظام کے ہر صیغہ اور حصّہ میں ترقی دکھائی دیتی ہے۔ مغربی شائستگی کا براق و نظر فریب رنگ تمام چیزوں پر چڑھتا جاتا ہے۔ ریل۔ ڈاک۔ تار۔ محکمہ آبپاشی وغیرہ میں روز افزوں ترقی نمایاں ہے۔ محاصل ملک میں اضافہ ہو رہا ہے۔ شہر و اہل شہر کی صفائی و رونق میں زیادتی دیکھی جاتی ہے۔ صنعت و حرفت و تجارت کی روز افزوں ترقی ہے۔ پریس کو پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ غرض عام طور پر ملک میں خوشنمائی بہبودی و ترقی کے آثار نمایاں ہیں جسکی داد انگریزوں کی خوش انتظامی کے سوا کسی کو نہیں مل سکتی۔ اس حسن انتظام کا بڑا حصہ لارڈ کرومر برٹش ایجنٹ کی اعلیٰ لیاقت کا ممنون ہے۔ جو شب و روز ملک مصر کی ترقی اور انگریزی فوائد کی حفاظت میں ساعی رہتے ہیں۔ اور اپنے فرائض بڑی دانشمندی سے ادا کرتے ہیں۔ ان کا اس وقت مصر میں وہ رعب و اثر ہے کہ کبھی کسی غیر کو نصیب نہیں ہوا۔

مسافروں کا قیام اور غیر قوموں کے کاروبار

ہوٹل اور لوکنڈے مسافروں کے قیام اور آرام کے واسطے قاہرہ میں متعدد مکانات بنے ہوئے ہیں۔ سب سے اعلیٰ درجے کا ہوٹل ازبکیہ میں ہے جس کو شیپرڈ ہوٹل کہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے جس قدر دولتمند سیاح قاہرہ اور مصر کی سیر کو آتے ہیں وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ اس ہوٹل میں فروکش ہونے والے کا روزانہ خرچ پندرہ روپے ہوتا ہے۔ اس ہوٹل کے متعلق ترجمانوں (انٹرپریٹر) کا بہت اچھا انتظام ہے۔ جو عربی کے علاوہ انگریزی۔ فرانسیسی۔ اطالین وغیرہ متعدد زبانیں جانتے ہیں۔ اور سیاحوں کو مقامات قدیمہ کی سیر میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی یومیہ اُجرت ڈھائی ریال یعنے ۱۲ کے قریب ہوتی ہے۔ ان ترجمانوں میں سے ایک شخص خشکری آفندی ہے جو مدراس کا رہنے والا اور مدت سے اس جگہ مقیم ہے۔

متوسط درجہ کے مسافروں کے واسطے ایک ریال (۴ہ) یومیہ سے لے کر ڈہائی ریال (۱۲) یومیہ مصارف کے ہوٹل ہیں۔ ان میں رہنے اور کھانے پینے کا جملہ انتظام یورپین طریق پر بہت عمدہ اور آرام دہ ہے۔

عام مسافروں کے واسطے شہر میں جگہ جگہ مسافر خانے موجود ہیں جن کو لوکنڈہ کہتے ہیں۔ ان میں صرف سونے کی جگہ ہوتی ہے اور کھانا بازار سے کھانا پڑتا ہے۔ کرایہ یومیہ کسی جگہ دو قرش یعنے ۵ر اور کسی جگہ ۴ قرش یعنے ۱۰ر یومیہ ہے ہر مسافر کے واسطے ایک پلنگ ہوتا ہے جس پر بستر و تکیہ وغیرہ سونے کے جملہ ضروریات مہیا ہوتی ہیں

ایک کرسی ایک میز۔ ایک کنگھا و آئینہ اور ایک برش بھی موجود رہتا ہے۔ پانی اور روشنی کا انتظام تمام کمروں اور سیڑھیوں میں مہتمم لوکندہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ بیت الخلا کے واسطے ایک علیحدہ اور صاف جگہ ہوتی ہے۔ آب دست کے واسطے پانی اسی جگہ موجود رہتا ہے۔ مُنہ ہاتھ دھونے کے واسطے پانی کا ایک پیپہ بھرا رہتا ہے۔ جس میں سے ٹونٹی کے ذریعے پانی نکلتا ہے۔ ایک کرسی اس پیپہ کے سامنے پڑی رہتی ہے اور تولیہ کھونٹی پر آویزاں ہوتا ہے۔ مسافر کرسی پر بیٹھکر مُنہ ہاتھ دھوتا ہے۔ اور تولیہ سے بدن خشک کرتا ہے۔

کرایہ کے مکان جن لوگوں کو زیادہ عرصے تک یہاں رہنا ہو۔ اُن کے واسطے بہتر ہے کہ مستقل طور سے کوئی مکان کرایہ پر لے لیں۔ جن مقامات میں ایسے مکان مل سکتے ہیں اُن کو یہاں کی اصطلاح میں وکالہ کہتے ہیں۔ ہر ایک وکالہ عموماً دو منزلہ عمارت ہوتی ہے اور ہر منزل میں پندرہ بیس بلکہ اس سے کچھ زیادہ کمرے ہوتے ہیں۔ نیچے کے کمرے دوکانوں کا کام دیتے ہیں۔ اور اوپر کے مسافروں کے اُترنے کے کام آتے ہیں۔ یہ وکالے مکانات کی وسعت اور اُنکی حیثیت کے لحاظ سے مختلف کرایہ کے ہیں۔ ادنیٰ درجے کے وکالے میں ایک مکان کے دو کمرے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔ پچھلے کمرے میں مسافر اپنا اسباب رکھتا ہے۔ اور اگلے کمرے کو اپنی ضروریات خورد ونوش۔ کھانے پکانے اور نہانے دھونے کے کام میں لاتا ہے۔ اس کا ماہوار کرایہ ۲۵ - ۳۰ قرش یا چار پانچ روپے کے قریب ہوتا ہے۔

اعلیٰ درجے کے وکالے کے ہر ایک مکان میں دو تین علیحدہ علیحدہ کمرے ہوتے ہیں نشست برخاست اور سونیکے واسطے جداگانہ کمرہ ہوتا ہے۔ غسل خانے اور باورچی خانے

کے کمرے علیحدہ ہوتے ہیں۔ ان کا ماہوار کرایہ ۶۰ قرش سے ۱۰۰ قرش تک یعنے للعہ
للعہ ماہوار کے قریب ہوتا ہے۔

اِن دونوں قسموں کے وکالوں میں فرش بہشتی اور روشنی کا انتظام مسافر کو اپنے خرچ سے کرنا پڑتا ہے۔ اگر مکانات فرش فروش سے آراستہ ہوں تو ان کا کرایہ زیادہ ہوتا ہے۔ مگر فرش دار کمرے صرف اعلیٰ درجے کے وکالوں میں ملسکتے ہیں

اِن وکالوں کے سوا اہال بچہ دار مسافر کو عموماً اور مجرد آدمیوں کو کبھی کبھی شہر کے باشندے اپنے سکنی مکانوں کا کچھ حصہ کرایہ پر دیدیتے ہیں۔ یہاں کے مکانات عام طور سے دو منزلے سہ منزلے ہوتے ہیں۔ کفایت شعار لوگ نیچے کے کمرے اور اوپر کا کچھ حصہ کرایہ پر دے دینا معیوب نہیں سمجھتے۔

غیر قوموں کے کاروبار یوروپ۔ ایشیا۔ افریقہ اور امریکہ کے ایک لاکھ[1] سے زیادہ تعداد کے آدمی اس وقت مصر کے اکثر اطراف وجوانب میں مثل قاہرہ۔ اسکندریہ رشید۔ دمیاط۔ پورٹ سعید۔ سویز۔ طنطا۔ منصورہ۔ زقازیق۔ اسیوط۔ وغیرہ کے پھیلے ہوئے ہیں۔ اور ان میں سے بیشتر آدمیوں کا یہ کام ہے کہ اپنے اپنے ملک کی مصنوعات کو مصر میں لاکر فروخت کرتے ہیں۔ یوروپین اور امریکن سوداگروں کی تجارتی اشیاء تو قریب وہی ہیں جو ہندوستان میں بک رہی ہیں۔ یعنے ہر قسم کے اُونی وسوتی کپڑے۔ آہنی اوزار۔ مثل چاقو۔ قینچی۔ استرا پستول۔ بندوق۔ مختلف اقسام کے بٹن۔ گھڑیاں۔ بوٹ۔ کاغذ۔ ظروف چینی و کانچ وغیرہ اشیاء جو روزمرہ کی ضروریات میں داخل ہیں۔ بعض یوروپین یونانیوں کی طرح تجارت کے علاوہ دوکانداری اور نوکری بھی کرتے ہیں لیکن ایشیا اور افریقہ کے

[1] ۔ اسکی تفصیل صفحہ ۲۵ میں لکھی جاچکی ہے۔

سوداگروں کی تجارتی اشیاء اور اُن کے کاروبار بمقابلہ تجارت سوداگران یورپ وامریکہ فی الجملہ مختلف ہیں۔ اس واسطے کچھ نامناسب نہ ہوگا اگر ایشیا۔ افریقہ اور نیز یونانیوں کے مشاغل کسی قدر تفصیل سے بیان کئے جائیں

(۱) مغاربہ یعنے طرابلس۔ تونس۔ الجزائر اور مراکو کے باشندے اکثر ترکی ٹوپیوں۔ کپڑے دیسی جوتیوں اور عقاقیر (جڑی بوٹی) کی تجارت کرتے ہیں۔ اور بعض لوگ ہندوستان کے راولوں کی مانند رمالی اور جفاری کا کام بھی کرتے ہیں۔ بعض آدمیوں کو زمین کے اندرونی حالات معلوم کرنے میں اچھا دخل ہے۔ یہ لوگ اس فن کو دفینے معلوم کرنے کا ذریعہ قرار دے کر امرا کو خوب لوٹتے ہیں۔ اوروں کو تو علی العموم یہ لوگ دہوکا دیا ہی کرتے تھے مگر پچھلے دنوں میں انگریزوں کو بھی خوب چقمہ دیا۔ اسکندریہ میں ایک انگریزی کمپنی کے ساتھ معاہدہ کرکے قاہرہ میں آئے۔ اور ایک پہاڑی کو کھدوانا شروع کیا۔ بہت دنوں تک اُن کے بیان کے موافق اندرون سطح زمین کی علامتیں ظاہر ہوتی رہیں۔ اور اس عرصے میں یہ لوگ کمپنی سے روپیہ لے کر کھاتے رہے۔ مگر ایک دن آخر شب کو چپکے سے بھاگ گئے۔

(۲) شامی۔ یہ لوگ عموماً بیروت اور اُس کے اطراف وجوانب کے عیسائی ہیں عربی زبان میں لکھنا پڑھنا خوب جانتے ہیں۔ اور انگریزی سے بھی باخبر ہیں۔ بعض لوگ گورنمنٹ مصر کے دفاتر سرکاری میں برسرکار ہیں۔ اور بعض نے اخبار نویسی کا مشغلہ جاری کر رکھا ہے۔ مقطم کا روزانہ اخبار ڈاکٹر صروف اور یعقوب آفندی کی زیر نگرانی چل رہا ہے۔ ایک پندرہ روزہ رسالہ الہلال جرجی زیدان کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ امین ہندیہ اور ابراہیم زیدان کتب فروشی کا کام کرتے ہیں۔

(۳) ترک۔ یہ لوگ اکثر استنبول اور بلاد ترکی کی مصنوعات منگا کر فروخت کرتے ہیں اور معدودے چند دفاتر سرکاری میں بھی برسر کار ہیں۔ عباس اول کے زمانے سے پیشتر انکی تعداد دفاتر اور فوج میں بہت تھی۔ مگر اب یوماً فیوماً کمی پر ہے۔

(۴) ارمنی۔ یہ لوگ اکثر صناع اور بعض تجارت پیشہ ہیں۔ سیگریٹ کے تمام بڑے بڑے کارخانے انہی کے ہاتھ میں ہیں۔ عربی ٹائپ کے حروف ڈھالنے میں ان کو خاص لیاقت ہے۔ نوبر پاشا سابق وزیر اعظم مصر کے زمانے میں جو ارمنی النسل تھا۔ انکو بہت ترقی ہوئی

(۵) بخاری۔ یہ لوگ قلیل التعداد ہیں۔ اور اکثر ٹوپیاں وغیرہ بیچتے ہیں۔

(۶) ایرانی۔ یہ لوگ اکثر تنباکو کی تجارت کرتے ہیں۔ اور اس سے اُنھوں نے خوب روپیہ پیدا کیا ہے۔ بعض لوگ باتصویر قلمی کتابیں۔ قالین۔ عقیق وغیرہ معدنیات بیچتے ہیں چند آدمی مُہر کنی اور چند آدمی برتنوں پر کندہ گری کا کام کرتے ہیں۔

(۷) ہندوستانی۔ یہ لوگ اکثر چین کا ریشمی سامان۔ ہندوستان کے بنارسی دوپٹے کشمیر کے شال عقیق اور قیمتی معدنیات طلائی اور نقرئی مینا کار برتن۔ مراد آباد کے تانبے کے برتن۔ ہندوستانی صنعت و حرفت کی پُرانی چیزیں بیچتے ہیں۔ ریشمی پارچات اور شال کی تجارت زیادہ تر کشمیری سوداگروں کے ہاتھ میں ہے۔ جنکی دوکانیں خان خلیلز میں ہیں۔ ان میں سے حاجی عبدالرسول کی دوکان بہت مشہور ہے۔ اور اُنھوں نے اسی جگہ شادی بھی کر لی ہے۔ تموّل اور حُسن معاشرت سے مصریوں میں بہت نیکنام ہیں حیدر آباد سندھ کے ہندوؤں کی متعدد دوکانیں ہندوستانی مصنوعات کی شیپرڈ ہوٹل کے ارد گرد ہیں جو یورپ و امریکہ کے سیاحوں کا سب سے بڑا فرودگاہ مصر میں ہے۔ یہ دوکانیں بہت شاندار اور باوقعت ہیں۔ مگر ان کے مالکوں نے تجارت کے سوا کوئی تعلق مصریوں سے

پیدا نہیں کیا۔

(۸) یونانی۔ غیر قوموں میں سب سے بڑی تعداد یونانیوں کی ہے۔ اور کوئی کام نہیں جو اِن کے ہاتھ سے محفوظ رہا ہو۔ یوروپ کا مال لاکر یہ بیچتے ہیں۔ یوروپین سوداگروں سے مال لے کر اندرونی سوداگری یہ کرتے ہیں۔ بقالی کے کام میں یہ مشہور ہیں۔ لوکنڈوں اور قہوؤں میں یہ ملازم ہیں۔ شراب خانے جو ایک ہزار سے زیادہ تعداد کے ہیں۔ اِن سب کے مالک اور مہتمم یہی ہیں۔ اور بالآخر جگہ جس کو یہاں کارخانہ کہتے ہیں اس میں بھی اُنہی کا اچھا خاصہ حصّہ ہے۔ غرض یہ لوگ اس کہاوت کے مصداق ہیں ؎

سب گنوں میں پورا ۔ مجھے کون کہے لنڈورا

(۹) سوڈانی۔ یہ لوگ آج سے تقریباً پچیس برس پیشتر اس جگہ بہت تھے۔ مگر مصری حکومت اور سوڈان کی باہمی لڑائیوں سے ان کی تعداد گھٹ گئی ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہئے۔ کہ بردہ فروشی کی ممانعت نے انکی تعداد کو گھٹا دیا ہے۔ یہی لوگ اکثر گھروں میں خدمتگاری کا کام کرتے ہیں۔

غیر قوموں کی حفاظت

ممالک غیر کے باشندے جن سلاطین یورپ ایشیا افریقہ یا امریکہ کی رعایا ہیں اُنھوں نے اپنا اپنا قنصل مصر میں مقرر کر رکھا ہے جو اِن سوداگروں کے حقوق کی نگرانی اور اپنی سلطنت کے فوائد کی حفاظت میں مصروف رہتا ہے اس وقت مصر میں قریباً ۲۰ قنصل حسب تفصیل ذیل موجود ہیں۔

(۱) انگلستان (۲) فرانس (۳) جرمنی (۴) روس (۵) اطالیہ (۶) ہسپانیہ (۷) پرتگال (۸) ڈنمارک (۹) ہالینڈ (۱۰) بلجیم (۱۱) آسٹریا (۱۲) سویڈن و ناروے (۱۳) سوئٹزرلینڈ (۱۴) یونان (۱۵) ایران (۱۶) مراکو (۱۷) ممالک متحدہ (۱۸) برازیل

(۱۹) مکسیکو۔

ہر ایک قنصل اور اُس کے دفتر کے لئے اُسکی سلطنت کی طرف سے مکانات موجود ہیں۔ بعض سلطنتوں نے یہ مکانات مول لے لئے ہیں۔ بعض نے کرایہ پر لے رکھے ہیں۔ جب کوئی پولیٹیکل یا تجارتی معاملہ کسی سلطنت کے حقوق کے خلاف ظاہر ہوتا نظر آتا ہے تو اس کا قنصل فوراً اپنی سلطنت کو اس امر کی اطلاع دیتا ہے۔ اور جو ہدایت وہاں سے صادر ہوتی ہے اُس کے مطابق دولت مصر سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا ہے۔ جو سلطنتیں مثل انگلستان جرمنی۔ فرانس اور روس کے اولوالعزم و زبردست ہیں اُن کے مطالبے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جو کمزور ہیں اُن کے دعاوی لیت و لعل میں پڑے رہتے ہیں اور برسوں تک طے نہیں ہوتے۔ اعلیٰ حضرت سلطان المعظم کی طرف سے بھی ایک معتمد ہمیشہ مصر میں مقیم رہتا ہے۔ جو ٹرکش ہائی کمشنر کہلاتا ہے۔ وہ تمام پولیٹیکل چالوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور اپنی سلطنت کی افسری مصر کا رعب داب قائم رکھنے میں ساعی ہوتا ہے۔ بالفعل اس منصب جلیل پر غازی احمد مختار پاشا مقرر ہیں جنھوں نے ۱۲۹۳ھ کی روم روس کی لڑائی میں بڑی ناموری حاصل کی تھی۔ یہ معاملہ فہمی اور حسن اخلاق کے باعث عام و خاص میں ہر دلعزیز مانے جاتے ہیں۔ اور بڑی شان و تمکنت سے ترکی اثر و اقتدار کو تھامے ہوئے ہیں۔ مجھے بھی ان سے نیاز حاصل کرنے کا اتفاق ہوا۔ بہت دیر تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرتے رہے۔

اسکندریہ کے حالات

اسکندریہ کی عظمت اور شوکت کے جو حالات ایام اقامت قاہرہ میں میرے گوش زد ہوتے رہے انھوں نے اس شہر کی سیر پر مجھے آمادہ کیا۔ میں نے تاریخی کتابوں میں پڑھا تھا کہ یہ شہر اسکندر اعظم کی یادگار ہے جس نے مسیح سے ۳۳۲ سال پیشتر اسکی بنیاد ڈالی تھی۔ عمدگی موقعہ کے باعث یہ شہر تھوڑے ہی دنوں میں بحیرۂ روم کا تجارتی بندرگاہ قرار پاگیا۔ اور ایشیا و یورپ کا مال یہاں سے گذرنے لگا۔ جس سے اس کو تمام دنیا میں شہرت عظیم حاصل ہوئی۔ اور تجارت کے ساتھ ساتھ علم و فضل کا مرکز بھی بنگیا۔ چنانچہ اب بھی تجارتی ترقیات کے باعث مصر کے تمام شہروں میں اس کا دوسرا درجہ مانا گیا ہے۔ ان مقامی خصوصیات کے علاوہ سعادتلو محمود بک سالم مصری کی ملاقات کی کشش بھی مجھے مجبور کر رہی تھی۔ جو ان دنوں اسکندریہ میں محکمہ مختلط کے قاضی (جج) ہیں۔ اِن سے میری دو تین ملاقاتیں قاہرہ میں ہوئی تھیں جن میں انھوں نے اسکندریہ کے سفر پر خصوصیت سے توجہ دلائی تھی۔

مَیں یکم مئی ۱۸۹۹ء کو قاہرہ سے روانہ ہوا اور ڈاک گاڑی کے ذریعہ ۲۰۸ کیلومیٹر (۱۲۸ میل) کی مسافت چار گھنٹے میں طے کی۔ اس لائن پر آٹھ دس بڑے بڑے آباد ریلوے اسٹیشن ہیں۔ جن میں سے اسٹیشن طنطا حضرت سید احمد بدوی رحمۃ اللہ علیہ کے مدفن ہونے کے باعث زیادہ تر مشہور ہے۔ سید احمدؒ مصریوں کی نگاہوں میں اسی احترام سے دیکھے جاتے ہیں جیسے ممالک مشرقی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح۔ جب گاڑی سکندریہ پہونچی تو مَیں گاڑی سے اتر کر شہر کو چلا۔ راستہ میں کسی جگہ معائنہ اسباب کی نوبت نہیں آئی۔

معلوم ہوا کہ اس ملک میں اندرونی تجارت پر کوئی محصول نہیں لیا جاتا۔ جو محصول ہے وہ صرف بیرونی تجارت پر ہے۔ جو سویز۔ پورٹ سعید۔ اور اسکندریہ کے بندرگاہوں پر جہاز سے اُترتے ہی وصول کیا جاتا ہے۔

اسکندریہ پہونچنے پر میں نے اپنا اسباب لالہ چیلارام سندھی تاجر کی دوکان پر رکھا۔ اور خود سعادتلو محمود بک کے مکان کا پتہ معلوم کرنے کے واسطے سیدھا محکمہ مختلط کو گیا۔ جج صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ نہایت تپاک سے ملے اور کچہری سے اُٹھنے کے بعد مجھے اپنے ہمراہ رملہ کو لے گئے۔ جو بیرون شہر ایک بڑی خوش فضا جگہ ہے۔ جج صاحب کا گھر اسی جگہ ہے اور روزانہ آمدورفت ریل کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جج صاحب نے مجھے شب باشی کے لئے مجبور کیا۔ رات آرام سے وہاں کاٹی اور اگلی صبح ان کے ہمراہ اسکندریہ کو چلا آیا۔ میرے ایام اقامت میں ان کا معمول تھا۔ کہ اکثر شام کے وقت کچہری سے اُٹھتے ہوئے مجھے اپنے ہمراہ لیجاتے اور صبح کو واپس لے آتے۔ جج صاحب بہت بڑے عالم ہیں۔ کئی سال سویٹزرلینڈ میں رہکر فرانسیسی زبان اور مغربی علوم کی تحصیل کی ہے۔ اُن کو قومی معاملات سے بڑی دلچسپی ہے۔ اکثر مسلمانوں کی بہتری کے متعلق سوچتے رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ سرکاری نوکری میں رہکر قومی معاملات میں پوری توجہ نہیں ہوسکتی۔ اس واسطے وہ چاہتے ہیں کہ قبل ازوقت پنشن لے کر قاہرہ میں وکالت کا کام کریں۔ اور قومی معاملات میں آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار فرماویں۔

اس عرصہ میں شہر کی سیر کرنے سے معلوم ہوا کہ اسکندریہ فی الحقیقت

بہت اعلیٰ درجہ کا شہر ہے۔ بازار وسیع اور مصفا ہیں۔ دورویہ چار چار۔ پانچ پانچ منزل
کے نہایت شاندار مکان ہیں۔ قہوہ خانے۔ تھیٹر۔ تجارتی کوٹھیاں۔ بنک اور سرکاری
عمارتیں اپنی خوشنمائی اور نفاست میں لندن اور پیرس کی جھلک دکھا رہی ہیں۔ بڑی سڑکوں
پر رات کو برقی روشنی ہوتی ہے۔ برقی ٹریوے شہر کے چاروں طرف دوڑتی نظر
آتی ہے۔ واٹر ورکس کے ذریعے مقطر پانی لوگوں کے استعمال میں آتا ہے۔ ریل
تار۔ ڈاک۔ اور ٹیلیفون کا انتظام بہت اعلیٰ پیمانہ پر ہے۔ وسط شہر میں منشیہ
کا چوک ایک عجیب منظر ہے جس کے ایک طرف محکمہ مختلط کی عظیم الشان عمارت
اور چوک کے بیچوں بیچ محمد علی پاشا بانی خاندان خدیویہ کا آہنی بُت نصب ہے۔ جو
گھوڑے کی سواری کی حالت میں بنایا گیا ہے۔ شہر کے ایک طرف ابو عبداللہ
بوصیری کا مقبرہ ہے جنہوں نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے محامد اور مناقب
میں قصیدہ بردہ لکھا تھا۔ یہ تمام قصیدہ مقبرہ کی اندرونی دیواروں پر نہایت خوشخط
حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔

بیرون شہر عمارات قدیمہ میں سے سنگ خارا کا ایک مینار ہے
جس کو عامود السواری کہتے ہیں۔ یہ مینار ۸۰ قدم اونچا اور ایک پتھر سے
تراش کر بنایا گیا ہے۔ اور اُن آثار قدیمہ کا بقیہ ہے۔ جو اسکندریہ
کی عجائبات میں شمار ہوتے تھے۔

دساور کا تمام مال پہلے یہاں آتا ہے۔ اور پھر یہاں سے مصر کے دیگر
شہروں میں جاتا ہے۔ اسی طرح مصر کی تمام پیداوار یہیں سے ہو کر ممالک
بعیدہ میں پہونچتی ہے۔ غرض تجارتی حیثیت اور عمارات کی عمدگی کے باعث کوئی

شہر مصر میں بلکہ کل افریقہ میں اس کا ہم پلہ نہیں۔ مگر علمی ترقی جو قدیم زمانہ میں اسکندریہ کا سرمایۂ فضیلت تھی وہ اب برائے نام باقی رہگئی ہے۔ مشرقی تعلیم کی دو ایک معمولی درسگاہیں ہیں۔ علوم جدیدہ کا کوئی بڑا مدرسہ سوا ے مدرسہ تجہیزیہ (ہائی سکول) کے نہیں ہے۔ عربی اخباروں کی تعداد بھی حواس خمسہ کے اندر ہی اندر ہے۔ ۱۸۸۲ء میں اعرابی پاشا کی بغاوت کے باعث انگریزی توپخانوں کی گولاباری سے اس شہر کی عمارتوں کو بہت نقصان پہونچا تھا۔ اور باشندوں پر بڑی تباہی نازل ہوئی تھی۔ مگر تجارت کا مرکز ہونے سے اس شہر کی آبادی پھر بھی روزافزوں ترقی پر ہے۔ اس ترقی کا اندازہ صرف اس سے ہو سکتا ہے کہ سنہ مذکور میں اسکی آبادی دو لاکھ ۳ ہزار تھی مگر ۱۸۹۷ء میں پندرہ برس کے عرصہ میں ۳ لاکھ ۲۰ ہزار ہوگئی۔ جنمیں ۴۶ ہزار یورپین تاجر ہیں۔ یہاں کی آب وہوا قربت ساحل کے باعث چونکہ موسم گرما میں خنک ہو جاتی ہے۔ اس واسطے خدیو معظم۔ اُن کے وزرار۔ اور اکثر امرائے مصر تبدیل ہوا کی غرض سے موسم گرما میں یہاں آجاتے ہیں۔

اسکندریہ کے مختصر حالات ختم کرنے سے پہلے یہ بیان کرنا ہے کہ اگلے زمانہ میں شہر کے سامنے فیراس ایک جزیرہ تھا۔ جہاں سفید سنگ مرمر کا وہ مشہور مینارہ تھا۔ جس کی روشنی بارہ کوس سے نظر آتی تھی۔ اور جو دنیا کے سات عجائبات میں سے گنا جاتا تھا۔ اس جزیرہ اور ساحل کے بیچ میں ایک پل تھا۔ جس کا طول تیرہ سو گیارہ گز تھا اور ۱۸ لاکھ روپے کے صرف سے یہ کل عمارت تیار ہوئی تھی۔

دوسرا حصہ
روم کے حالات

قسطنطنیہ کا سفر

سمرنا میں ۱۰ مئی ۱۸۹۹ء کو اسکندریہ سے استنبول کو روانہ ہوا۔ تیسرے دن ہمارا جہاز دوپہر کے قریب ازمیر پہونچا۔ جسے انگریزی میں سمرنا کہتے ہیں۔ یہ شہر ایشیاکوچک کے تمام تجارتی بندرگاہوں میں سب سے بڑا اور ایشیاکوچک کا صدر مقام ہے۔ اسکی موجودہ آبادی ایک لاکھ سے زایڈ ہے۔ بوجہ تجارتی مرکز ہونے کے اِسے بہت بڑی رونق حاصل ہے۔ تاجر لوگ خشکی اور تری سے یہاں مال لاتے ہیں۔ ریشم۔ روئی۔ اُون کی تجارت کو خوب ترقی ہے۔ انگور اور انجیر یہاں بہت اعلیٰ درجہ کے ہوتے ہیں۔ اور نہایت ارزاں بکتے ہیں۔

یہاں کا بندرگاہ جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے واسطے نہایت مناسب ہے۔ اس میں بیسیوں دخانی جہاز ہر وقت دکھائی دیتے ہیں۔ بندرگاہ کے ساتھ ساتھ ٹریوے جاری ہے۔ بلند و شاندار عمارتیں۔ ہوٹل

قہوہ خانے۔ تھیٹر۔ ناچ گھر۔ دور تک بخط مستقیم دریا کے کنارے کنارے چلے گئے ہیں۔ دن کو یہاں کا نظارہ ایسا خوشنما اور پر فضا نظر آتا ہے۔ اور لوگوں کی اس کثرت سے چہل پہل رہتی ہے کہ میلہ کا سماں یا شادی کی تقریب معلوم ہوتی ہے۔ گلی کوچے ایسے صاف اور ستھرے ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے۔ لیکن یہ سب شہر کا بیرونی حصہ ہے جس میں بکثرت عیسائی آباد ہیں۔ اور جہاں کی رونق وشان زیادہ تر ان لوگوں کی شائستگی اور ستھرے پن کو ظاہر کرتی ہے۔ اصل شہر اندر کی طرف ہے۔ جو نہایت بارونق ہے۔ اور آدمیوں کی کثرت سے ہر وقت میلا سا لگا رہتا ہے۔ مگر ہائے رے ایشیائی مذاق سڑکیں وہی ناہموار و غلیظ۔ گلی کوچے میلے نجاست اور کیچڑ کی وجہ سے رستہ چلنا دشوار۔

تاریخی اعتبار سے اس شہر کو کئی خصوصیتیں حاصل ہیں۔ یونانیوں کا مشہور شاعر ہومر یہیں پیدا ہوا تھا۔ اور ایک عرصہ دراز تک اسکا بت بھی یہاں موجود رہا۔ انجیل کے سفر رویا میں جن سات مقدس گرجوں کا ذکر ہے۔ ان میں کا ایک گرجا اسی شہر میں تھا۔ یہ شہر لڑائیوں اور زلزلوں کے باعث دس مرتبہ برباد ہو چکا ہے۔

سمرنا میں اب بھی بڑے شہروں کی شان نظر آتی ہے۔ اسلامی آثار بھی یہاں بکثرت ہیں۔ کئی سو مساجد ہیں۔ جو شان وشوکت میں بہت بڑھ چڑھ کر ہیں۔ ان میں ایک مسجد جامع حصار ہے۔ جو نہایت تکلف سے آراستہ کی گئی ہے اسکی چھت پر سنہری بیل بوٹے ہیں۔ اور اس کے صحن کے دونو جانب دو بڑے بڑے ستونوں پر گھنٹے لگے ہیں۔ جو اوقات نماز بتلاتے ہیں اور مسجد کی زینت کو

دوبالا کرتے ہیں۔ اس مسجد کے پہلو میں ایک مختصر سا کتب خانہ بھی ہے جس میں کتابوں کی تین چار چھوٹی چھوٹی الماریاں رکھی ہوئی ہیں۔ نماز جمعہ کے بعد اکثر علما یہاں جمع ہو کر کبھی تو مطالعۂ کتب کا شغل کرتے ہیں۔ اور کبھی کسی مسئلہ پر آپس میں گفتگو۔

اسکندریہ سے چلتے وقت خوش قسمتی سے دو مسلمان مسافر مجھے مل گئے۔ ایک ایران کا اور دوسرا روس کا باشندہ تھا۔ یہ دونوں ترکی خوب جانتے تھے۔ اور ان سے مصر میں بھی ملاقات ہوئی تھی۔ چونکہ ازمیر کے باشندوں کی ترکی زبان ہے۔ اس لئے یہ دونوں صاحب بوقت ضرورت بطور ترجمان میری مدد کرتے تھے۔ ان کی مہربانی سے مجھے شہر کی سیر کا خوب موقعہ ملا۔ ہم لوگ چار پانچ گھنٹے کے قریب شہر میں پھرتے رہے اور سیر سے فارغ ہونے کے بعد جہاز پر آئے۔ اور جہاز نے پھر لنگر اٹھایا۔

سمرنا سے روانگی سمرنا سے قسطنطنیہ کا سفر نہایت دلچسپ اور خوش کن ہے۔ سمرنا سے روانہ ہو کر جہاز آدھ گھنٹہ میں قلعہ سمرنا۔ کوہ یاگوس۔ اور اس پرانے قلعہ کو جو خلیج سمرنا کے دہانے کی حفاظت کرتا ہے۔ پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔ اور شہر کا دور سے ایسا دلچسپ سماں نظروں کے آگے پیش کرتا ہے جسے دیکھکر طبیعت نہایت محظوظ ہوتی ہے۔ شام کے وقت چراغوں۔ لال ٹینوں اور لمپوں کی روشنی اس دلکش نظارہ کے لطف کو دوبالا کر دیتی ہے۔ دوسرے روز علی الصباح جزیرہ مٹی لیں پر نظر پڑتی ہے۔ جو بحیرہ روم کی نیلگوں سطح پر طلوع آفتاب سے پہلے پہلے ایک دلفریب ادا سے سر سبز درختوں میں اپنا منہ چھپائے ہوئے

سیاحوں کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہاں زیادہ تر یونانی آباد ہیں۔ میدان یہاں کا نہایت ہموار ہے۔ یہاں سے جہاز بحیرۂ روم کو خیرباد کہکر ڈارڈ نیلز میں داخل ہوتا ہے۔

ڈارڈ نیلز آبنائے ڈارڈ نیلز ایک تنگ بحری گذرگاہ ہے۔ جو بحیرۂ روم کو بحیرہ مارمورا سے ملحق کرتا ہے۔ اور طول میں ۴۵ میل ہے۔ اس کا عرض کہیں چوتھائی میل سے بھی کم اور کہیں تین میل سے چار میل تک ہے۔ بحیرہ روم کی جانب اس کا دہانہ تین میل چوڑا ہے۔ جس کے یوروپی ساحل پر قلعہ کلید بحر اور ایشیائی کنارے پر قلعہ قوم ناکہ بندی کئے ہوئے ہیں۔ ڈارڈ نیلز چونکہ قسطنطینہ کا ایک ناکہ ہے۔ اس کو جا بجا دورویہ قلعوں کرپ کی توپوں اور تارپیڈو کشتیوں سے ایسا محفوظ کیا گیا ہے کہ کسی فریق مخالف کا بیڑہ خواہ کیسا ہی زبردست کیوں نہ ہو بلا مرضی سلطان المعظم یہاں قدم نہیں رکھ سکتا۔ سلطنت کی طرف سے روز بروز اسکے زیادہ مستحکم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ چنانچہ پرانے قلعوں کی تجدید و مرمت کے علاوہ نئے قلعے بھی تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور نئی توپوں اور جدید آلات جنگ سے آراستہ کئے جاتے ہیں۔ تباہ کن تارپیڈو کشتیوں کی تعداد میں ہمیشہ ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ۱۸۹۵-۹۶ء فسادات آرمینیہ کے زمانے میں جب دول یورپ نے اپنے متفقہ بیڑے کو قسطنطنیہ روانہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تو ڈارڈ نیلز عبور کرنے کی جرأت کسی سے بھی نہ ہو سکی بلکہ لارڈ سالسبری نے اپنی ایک تقریر میں صاف صاف الفاظ میں اقرار کیا کہ "ہمارا بیڑہ بجز اسکے کہ ٹرکی کے چند ساحلی پر مسٹ خانوں کو معدوم کردے ترکوں کا

اور کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

ڈارڈنیلز کا ایک تہائی حصہ عبور کرنے کے بعد جہاز قلعہ چناق پر پہونچتا ہے۔ جہاں سمندر کا عرض صرف چوتھائی میل کے برابر ہے۔ یہاں پر جہازوں کو اپنے کاغذات راہداری ملاحظہ کرانے پڑتے ہیں۔ اور بشرط ضرورت مسافروں کا طبی معائنہ بھی ہوتا ہے۔ قلعہ چناق کے نواح میں مٹی کے برتن نہایت نفیس اور خوشنما بنتے ہیں۔ صراحیاں بالخصوص نفیس اور عمدہ رنگ و روغن کی ہوتی ہیں جنہیں وہاں کے باشندے کشتیوں میں لاد کر مسافران جہاز کے پاس فروخت کی غرض سے لاتے ہیں۔

چناق سے ذرا آگے بڑھ کر جہاز پھر آبنائے کے کسی قدر چوڑے حصہ میں آجاتا ہے۔ دو طرفہ کوہستانی نظارے بلا مبالغہ نہایت دلکش ہیں۔ کوہ نگارا کے قریب پھر یہ گذرگاہ تنگ ہو جاتی ہے۔ جہاں اس کا عرض صرف پانسو قدم رہجاتا ہے۔ یہاں یوروپین ساحل پر ایک چٹانی راس آگے کو نکلی ہوئی ہے جو تاریخی اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ کیونکہ بیان کیا جاتا ہے۔ کہ جب کیخسرو شاہ ایران نے یونان پر حملہ کیا تو اسی مقام پر کشتیوں کا پل بنا کر یوروپ میں داخل ہوا تھا سکندر نے بھی یوروپ سے ایشیا کو جاتے ہوئے اپنی فوج کے واسطے یہی راستہ لیا تھا۔ ۱۳۶۹ء میں شہزادہ سلیمان کی زیر کمان ترکی افواج یہیں سے ڈارڈنیلز کو عبور کر کے پہلی مرتبہ یوروپ میں داخل ہوئی تھیں۔ زمانہ قدیم میں ڈارڈنیلز کا یہ حصہ ہیلس پائینٹ کہلاتا تھا۔ اور جس خاص موقعہ پر تنگ گذرگاہ ہے اس کے دونوں طرف سیس ٹس اور ابی دس کے شہر واقع تھے اس سے آگے بڑھ کر سمندر کا عرض تقریباً ۳ سے ۵ میل ہو جاتا ہے۔ یہاں پر

کناروں کی پہاڑیاں چونہ دار چٹانوں کی ہیں۔ اور ایسی ہموار اور مسطح واقع ہوئی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے ان پر رولر پھیر دیا ہے۔

ڈارڈنیلز کے ختم اور بحیرہ مارمورا کے شروع ہوتے ہی گلی پولی کا قدیم شہر آجاتا ہے۔ جو ڈارڈنیلز کے بعد قسطنطنیہ باسفورس اور بحیرہ اسود کی کلید تصور کیا جاتا ہے۔ یہی باعث ہے کہ ۱۸۵۵ء میں محاربۂ کریمیا کے موقعہ پر روسیوں کی دست درازیوں کو روکنے کی غرض سے فرانس اور انگلستان نے متفقہ طور پر اس مقام پر قیام کرنا پسند کیا تھا۔

بحیرۂ مارمورا اب یہاں سے ہمارا جہاز بحیرۂ مارمورا کے یورپی ساحل کے کنارے کنارے آگے بڑھا۔ جو نہایت سرسبز و شاداب ہے۔ بحیرۂ مارمورا مشرق سے مغرب تک ایک سو دس میل لمبا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی اسکی چالیس میل ہے۔ ایک وسیع تختۂ آب نظر آتا ہے۔ لیکن یہ کچھ ایسا زیادہ خوبصورت نہیں جہاز چونکہ یورپی کنارے کے قریب ہو کر گذرا تھا۔ اس لئے ہم خشکی کی خوب سیر کرتے آئے۔ کچھ دور جا کر ہمارا جہاز بندر روڈسٹو پر ٹھرا۔ جو گلی پولی اور قسطنطنیہ کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ یہ ایک غلیظ و بدنما شہر معلوم ہوتا ہے۔ ۱۸۹۷ء کے محاربۂ روم و یونان میں جو افواج ایشیا سے سرحد یونان کو روانہ کی گئیں انکا گذر عموماً اسی بندرگاہ سے ہوا تھا۔ اس وجہ سے اس مقام کو اچھی خاصی شہرت ہو گئی ہے

بندر روڈسٹو سے آگے بڑھکر ساحل میں کچھ ایسی دلفریبی نہیں پائی جاتی۔ مگر راستہ میں قسطنطنیہ سے ۹ میل جنوب مشرق کی جانب ساحل کے متوازی پرنکیو جزائر کا مجموعہ ملتا ہے۔ وہ البتہ دلفریب و خوشنما ہے۔ یہ جزائر تعداد میں ۹ ہیں

اور قسطنطنیہ کی میونسپلٹی کے حدود میں داخل ہیں۔ یہاں کچھ عرصہ سے ہر سال بحری قواعد اور دوڑیں ہوا کرتی ہیں۔

قسطنطنیہ کا منظر دریا سے بالآخر سمرنا سے ہمارا جہاز تین سو میل کی مسافت طے کر کے قسطنطنیہ پہونچتا ہے۔ جہاں طلوع آفتاب سے قبل اور مرغ سحری کی بانگ سے ذرا پہلے نسیم سحری کے خوش آیند جھونکوں کے ساتھ ایک ایسا ازخود رفتگی پیدا کرنے والا منظر جہاز کے مسافر کے پیش نظر ہوتا ہے جس کی تصویر بالفاظ میں کھینچنی انسانی قدرت سے باہر ہے۔ جہاز ابھی ذرا فاصلہ پر ہوتا ہے کہ دائیں جانب جزائر پرونٹ۔ آرنی۔ گون۔ ملکی۔ وغیرہ دلفریبی کے ساتھ پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور بائیں جانب استنبول و مضافات استنبول کی عالیشان عمارات۔ پرانی محلسرائے۔ مساجد۔ مینارے۔ وغیرہ نگاہوں کے سامنے آتے جاتے ہیں بتدریج مسجد ایا صوفیہ کی شاندار عمارت۔ غلطہ۔ توپخانہ اور پیرا کا منظر نگاہوں کے سامنے آکر تماشائیوں کو محو کر دیتا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھکر داہنی طرف کو باسفرس مستانہ انداز سے لہراتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس کی کیفیت کو سینکڑوں معمولی اور دخانی کشتیاں دوبالا کرتی ہیں۔ یہاں سے ایشیائی ساحل پر نظر پڑتی ہے اُسکدار کی آبادی۔ قاضی کوئی کے عالیشان محلات و پُرفضا باغات اور کالیسڈون کے آثار قدیمہ اترا اترا کر اپنا جلوہ دکھلاتے ہیں۔ ان دلچسپیوں میں انسان محو ہوتا ہے کہ یک بیک جہاز گولڈن ہارن (یعنے شاخ زرین) میں پہونچکر کشتیوں کے پُل کے پاس استنبول کے کنارے کے قریب لنگر ڈالدیتا ہے۔

گولڈن ہارن آبنائے باسفرس کے جنوب میں سمندر کا ایک تنگ سا حصہ یورپین

ساحل کے اندر چلا گیا ہے۔ جہاں پہونچکر اس نے بارہ سنگے کے سینگ کی شکل اختیار کرلی ہے۔ قدیم زمانہ سے اس کو گولڈن ہارن یا شاخ زرین کہتے ہیں۔ زرین کا لفظ اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ قسطنطنیہ کا بندرگاہ ہمیشہ سے بڑا محفوظ رہا ہے جس میں ہر طرف سے دولت کھچی چلی آتی تھی۔ دنیا میں ایسا خوبصورت اور عالیشان کوئی بندرگاہ نہیں۔ اس کے دونوں طرف قسطنطنیہ کی آبادی ہے۔ اور اس پر دو پل تعمیر ہیں۔ جن پر لوگوں کی آمدورفت ہے۔

جہاز سے اترنا جو جہاز قسطنطنیہ میں پہونچتا ہے۔ گولڈن ہارن میں اس کے لنگر انداز ہونے کے واسطے یہ لازم ہے کہ پہلے سلطان المعظم کے بحری دفتر سے اجازت حاصل کرے۔ تاکہ عہدہ داران دفتر کو معلوم ہو جائے کہ یہ کس ملک کا جہاز ہے۔ کس غرض سے یہاں آیا ہے۔ اور کب تک ٹھہریگا۔ ان جملہ امور کا اطمینان ہونیکے بعد اجازت ملتی ہے۔ اور جہاز گولڈن ہارن میں آکر لنگر انداز ہوتا ہے۔ چنانچہ ہمارے جہاز کا کپتان بھی دفتر سلطانی میں اسی غرض سے گیا۔ اور اسکے انتظار میں ہمارا جہاز بہت دیر تک فاصلہ پر ٹھہرا رہا۔ جب وہ واپس آیا تو پھر جہاز اپنے موقعہ پر لنگر انداز ہوا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ غروب آفتاب سے طلوع آفتاب تک کوئی جہاز گولڈن ہارن میں لنگر انداز نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے جہاز کا کپتان ہمیشہ کوشش کرتا ہے کہ چار بجے سے بیشتر جہاز اس جگہ پہونچ جائے۔ تاکہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے اجازت لے کر گولڈن ہارن میں لنگر انداز ہو سکے۔

ہم تین مسافر تین علیحدہ علیحدہ سلطنتوں کی رعایا تھے۔ میں انگریزی

رعایا تھا۔ میرے دوست محمد حسین تبریزی ایران کی رعایا۔ اور رجواد روس کی رعیت تھا۔ ہم میں سے کسی کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ ہمیں علیحدہ علیحدہ بندرگاہوں پر اُترنا ہوگا۔ کشتیبان ہم سب کو استنبول کے بندرگاہ پر لے گیا۔ جب وہاں پاسپورٹ پیش ہوئے تو رئیس پاسپورٹ نے محمد حسین کو شہر میں جانے کی اجازت دیدی۔ مگر ہم دونوں کو کہا کہ غلطہ کے بندر پر جاؤ۔ رئیس پاسپورٹ عربی خوب جانتا تھا۔ اس سے میری گفتگو حسب ذیل ہوئی۔

میں۔ کیا ہم میں سے صرف ایرانی مسلمان تھا۔ کہ اس کو شہر میں جانے کی اجازت ہوئی۔

رئیس۔ نہیں آپ بھی مسلمان ہیں۔ مگر پابندی قانون سے لاچاری ہے۔

میں۔ آخر ایسا کیا قانون ہے جو مسلمانوں میں علیحدگی کا باعث ہو۔

رئیس۔ قانون بین الاقوام کے مطابق یہ بات قرار پاچکی ہے کہ ترکی۔ مصری۔ اور ایرانی رعایا کے لوگ استنبول کے بندرگاہ پر اُتریں۔ اور دیگر ممالک کی رعایا غلطہ کے بندرگاہ پر۔

میں۔ یہ کشتیبان کی غلطی ہے کہ وہ ہم سب کو بلا دریافت اس بندر پر لے آیا۔

رئیس۔ میں کشتیبان کو حکم دیتا ہوں کہ وہ آپ کو غلطہ کے بندر پر لے جائے۔

میں۔ سابقہ اُجرت کے علاوہ کشتیبان کو اور کیا اُجرت دینی ہوگی۔

رئیس۔ اس کو زائد اُجرت ہرگز نہ دیجائے۔

اس سوال و جواب کے بعد ہم دونوں کشتی پر سوار ہوکر غلطہ کے بندر پر پہونچے۔ ہمارا اسباب جنگی خانے میں رکھا گیا۔ اور ہمیں دفتر پاسپورٹ میں

جانے کی ہدایت ہوئی۔ اس جگہ پاسپورٹ کا اندراج ہو کر ہم رخصت ہوئے اور چنگی خانے میں اسباب کی پڑتال کرانے لگے۔ محرر چنگی بھی کوئی بھلا آدمی تھا۔ اس نے دوران پڑتال میں پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو۔ میں نے کہا ہندوستان سے۔ یہ سنکر کہنے لگا۔ "ہندی ولی اللہ" زیادہ پڑتال کی کچھ ضرورت نہیں۔ اس کے بعد قلیوں کو ہدایت کی کہ ہمارا اسباب اٹھالیں۔ اور اجرت مقرر کر دی تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو۔ ترکوں کی خوش خلقی کا یہ پہلا نمونہ تھا جو بندر استنبول کے رئیس پاسپورٹ اور غلطہ کے محرر چنگی سے ظاہر ہوا۔

میں استنبول کے حالات سے ناواقف تھا۔ میرا ہمراہی جواد مجھے ایک لوکندہ میں لیگیا۔ یہ لوکندہ صرف شب باشی کے واسطے ہے۔ نیچے کے حصہ میں ملازمان لوکندہ اور قہوہ خانہ ہے۔ اور اوپر کی منزل میں مسافر ٹھہرتے ہیں۔ ہر کمرہ پر نمبر لگا ہوا ہے۔ جب کوئی مسافر باہر جاتا ہے تو چابی تختہ پر لٹکا جاتا ہے۔ اور جب آتا ہے تو وہاں سے لے لیتا ہے۔ ملازمان لوکندہ اس امر کے ذمہ وار ہیں کہ جو مسافر جس کمرہ میں ٹھہرا ہے۔ وہی اس کمرے کی چابی اٹھائے۔ لوکندہ کا کرایہ چار قرش یعنے ۸ ر یومیہ ہے۔ پلنگ۔ بستر۔ میز۔ کرسی۔ کنگھا۔ صراحی۔ لیمپ۔ پانی وغیرہ جملہ ضروریات کا انتظام مہتمم لوکندہ کی طرف سے بہت خوبی سے ہوتا ہے۔

جب ہم لوگ لوکندہ میں پہونچے۔ تو سب سے پہلے مہتمم لوکندہ نے پاسپورٹ مانگا۔ اور کہا کہ میں اس کے مطابق آپ لوگوں کے نام درج رجسٹر کرونگا۔ اور صبح ترکی قراقول (پولیس سٹیشن) میں دکھلا کر آپ کو واپس دے دونگا۔ معلوم ہوا کہ یہاں یہ دستور ہے کہ جملہ مسافران جو لوکندوں میں ٹھہر

ان کے نام درج رجسٹر ہوکر نقل پولیس میں بھیجی جاتی ہے۔ تاکہ حاکم شہر کو ہر مسافر کی نقل و حرکت کی اطلاع رہے۔

اس ضمن میں یہ بھی معلوم ہوا کہ جس مسافر کے پاس کسی سلطنت کی طرف سے پاسپورٹ نہ ہو ہوٹل کا مہتمم اسکو اپنے ہاں نہیں ٹھہراتا۔ اگر احیاناً کسی لالچ یا غلطی سے اسکو ٹھہرائے تو پولیس کی طرف سے اس کا قرار واقعی تدارک عمل میں آتا ہے۔ بلکہ اس معاملہ میں سلطنت کی طرف سے اس قدر سخت حکم ہے۔ کہ جو مسافر بلا پاسپورٹ جہاز پر سوار ہوکر باہر سے آئے اُسکو شہر کے اندر جانے کی اجازت نہ دیجاوے۔ اگر اس مسافر کے پاس ایسے وسائل ہوں کہ اپنی سلطنت کے قونصل مقیم قسطنطنیہ سے پاسپورٹ حاصل کر سکتا ہو تو قونصل مذکور کے پاس اس کو بھجوا دیتے ہیں۔ اگر اُس نے پاسپورٹ دیدیا تو بہتر ورنہ جہاں سے وہ آیا ہو سرکاری خرچ سے اُس کو وہیں واپس کر دیتے ہیں۔

قسطنطنیہ کے حالات

ابتدائی تاریخ شہر قسطنطنیہ دنیا کے بڑے قدیم شہروں میں شمار کیا جاتا ہے اور قسطنطین اعظم کی یادگار ہے۔ جس نے سنہ ۳۳۰ء میں اسکی بنا ڈالی تھی۔ یہ قسطنطین رومۃ الکبریٰ کی سلطنت کا نامور شہنشاہ تھا۔ اس کے زمانہ میں یہ سلطنت بڑی زبردست اور عظیم الشان مانی جاتی تھی۔ ایشیا یورپ وافریقہ کے فرمانروا سب اسکی اطاعت کا دم بھرتے تھے۔ چوتھی صدی مسیحی کے آغاز میں جب ملکی انقلابات نے قسطنطین اعظم کو دین مسیحی قبول کرنے پر مجبور کیا اور چند در چند مصلحتوں سے قدیمی دارالحکومت روم واقع اٹلی کے علاوہ ایک نیا دارالحکومت قائم کرنا ضروری معلوم ہوا تو اس نے یونانیوں کے شہر بوزن طینیا (بائزن ٹائن) کو بڑھا کر اپنے نام سے ایک نیا شہر قسطنطنیہ آباد کیا۔ اور اسکو مشرقی رومن امپائر کا پایہ تخت قرار دیا۔ قسطنطنیہ اگرچہ شہر روم سے بہت فاصلہ پر واقع ہے۔ مگر شاہان رومن امپائر کا پایہ تخت ہونے سے اس کی سرزمین کا نام بھی ملک روم مشہور ہوگیا۔

یہ شہر قریباً گیارہ سو برس عیسائیوں کے زیر حکومت رہا۔ اور سنہ ۸۵۷ھ مطابق سنہ ۱۴۵۳ء میں سلطان ابوالفتح محمد خان[۱] ثانی فاتح روم کے ہاتھوں مفتوح ہوکر اسے مسلمانوں کے قبضے میں آجانے کا شرف حاصل ہوا۔ یوں تو قسطنطنیہ کی فتح کا قصد امیر معاویہ کے زمانے سے شروع ہوکر خلفائے بنی عباس تک

---

[۱] یہ بادشاہ ۸۵۵ھ میں تخت نشین ہوا۔ اور ۸۸۶ھ (۱۴۸۱ء) میں فوت ہوا۔

برابر جاری رہا۔ اور ۴۶۱ھ (مطابق ۱۰۶۸ء) میں الپ ارسلان سلجوقی نے بھی اس پر فوج کشی کی۔ مگر اس کی فتح اور مسلمانوں کی دیرینہ مراد بر لانے کا فخر خدا نے سلطان ابوالفتح محمد خان ثانی ہی کے لئے رکھا تھا۔ اس شہر کے فتح کرنے میں ترکوں نے حیرت انگیز دلیری اور شجاعت کا اظہار کیا۔ اور بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ اس زمانے میں سلطان ابوالفتح محمد خان ثانی کی عمر ۲۳ سال سے زائد نہ تھی **بلدہ طیبہ** اس شہر کا مادہ تاریخی ہے۔ جس روز یہ شہر مسلمانوں کے تصرف میں آیا اُس روز سے۔ استنبول۔ آستانہ۔ دار السعادت کے القاب اس کو حاصل ہونے شروع ہوئے۔

یہ شہر ایشیا و یورپ کے درمیان ایسے موقع پر واقع ہوا ہے کہ سیاسی اور جغرافی حیثیتوں سے دنیا کے تمام شہروں سے اس کو اہمیت حاصل ہے اور یہی وجہ ہے کہ فرانس کا مشہور فرمانروا اور نامور کشور کشا نپولین بونا پارٹ اکثر کہا کرتا تھا" جس کے قبضہ میں ساری دنیا کی سلطنت ہو اُس کے لئے قسطنطنیہ سے بہتر پایہ تخت نہیں ہو سکتا"۔

استنبول

قسطنطنیہ کی آبادی دراصل دو حصوں میں منقسم ہے (۱) استنبول۔ (۲) غلطہ۔ ان میں سے شاخ زرین اور بحر مارمورا کے درمیان جو قدیم آبادی واقع ہے۔ استنبول کہلاتی ہے۔ اس کا محیط بارہ میل ہے۔ اور فصیل ۱۴ قدم سے ۳۰ قدم تک بلند ہے۔ یہ شہر سات پہاڑیوں اور اُن کے درمیانی نشیبوں میں آباد ہے۔ چلنے پھرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہم نیچے تھے اور ذرہ کی ذرہ میں اوپر پہونچ گئے۔ یا ابھی فلک الافلاک پر تھے۔ اور

آن کی آن میں تحت الثریٰ میں چلے گئے۔ اس نشیب و فراز سے ایک خوبی البتہ پیدا ہوتی ہے کہ بلند مقام سے سارے شہر کی سیر بخوبی ہو سکتی ہے

یہاں مسلمانوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ قدیم عمارات۔ عالیشان مساجد۔ سلاطین گذشتہ کے مقبرے۔ ہوٹل۔ حمام۔ کتب خانے وغیرہ سب یہیں ہیں۔ باب عالی جو وزرائے عثمانی کے اجلاس کی جگہ ہے۔ اور جامع ایا صوفیا جس کی عمارت کا دنیا میں چرچا ہے اسی حصہ میں واقع ہے۔ آبادی کے اس حصے پر ایشیائی رنگ غالب ہے۔

بازار بڑی دور تک لمبے چوڑے چلے گئے ہیں۔ جن کی پوری طرح سیر کرنے کے لئے کئی دن چاہئیں۔ چارسو یہاں کا مشہور شاندار مقام ہے۔ جو متعدد چھتے ہوئے بازاروں کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ بازار پہلو بہ پہلو ایک دوسرے کے متوازی تعمیر کئے گئے ہیں۔ اور ایک سے دوسرے میں جانیکے لئے راستے رکھے گئے ہیں۔ اوپر سے ان سبھوں کو پاٹ دیا گیا ہے تاکہ دھوپ و بارش سے حفاظت رہے۔ جابجا ہوا اور روشنی کے لئے کھڑکیاں رکھی گئی ہیں۔ جو حسب ضرورت کھولی اور بند کی جا سکتی ہیں۔ رات کو ان بازاروں کے پھاٹک بند کر دئے جاتے ہیں۔ اور چوکیدار پھاٹک پر حاضر رہتا ہے۔ اس سے کوئی غیر شخص اندر نہیں جانے پاتا۔ اس لئے رات کو یہاں کوئی واردات نہیں ہونے پاتی۔ ان بازاروں میں ہر قسم کے سامان خواہ وہ اس ملک کا ہو یا کسی غیر ملک کا خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے۔ علاوہ دوکانوں میں مالیت زیادہ ہونے کے دکانوں کی ظاہری وضع قطع بھی عموماً

شاندار ہے۔ جدا جدا سامان کی تجارت کے لئے جدا جدا بازار ہیں۔ کسی بازار میں قالین۔ دریاں و جانمازیں وغیرہ وغیرہ فروخت ہوتی ہیں۔ کسی میں ریشمی پارچات کسی میں برتن۔ کسی میں چرمی اسباب۔ کسی میں محض غلّہ کسی میں بساتیوں کا سامان۔ کہیں عطریات اور کہیں کھانے پینے کی چیزیں۔ جابجا ارمنی صراف اپنی چھوٹی چھوٹی دوکانوں میں جالیدار دروازوں کو بند کئے ہوئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور دنیا کے ہر حصے کے سکوں کے تبادلہ پر آمادہ پائے جاتے ہیں۔ دوکانوں پر اکثر نوجوان خوبصورت لڑکے بطور نوکر کے کام کرتے ہیں جو خریدار کو اپنی دوکانوں کیطرف لطائف الحیل سے کھینچتے ہیں۔ اور خواہ اسے کچھ خریدنا منظور ہو یا نہ ہو اس کے متوجہ کرنے میں پوری کوشش کرتے ہیں۔

استنبول میں کتے بہت کثرت سے ہیں۔ مختلف گلی کوچوں میں درجنوں کی درجنیں ہوتے ہیں۔ مگر کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ اگر کوئی شخص ان کتوں کو ان کی گلیوں میں مارے پیٹے۔ تو ترک برا مانتے ہیں۔ کیونکہ گلی کوچے وہ ان کتوں کا ترکہ سمجھتے ہیں۔

غلطہ شاخ زرین اور باسفرس کے درمیان کسی قدر بلندی پر جو حصہ واقع ہے اُس کو غلطہ کہتے ہیں۔ اس کے مختلف حصے توپخانہ۔ غلطہ۔ اور پیرہ کے ناموں سے موسوم ہیں۔ جو دراصل تین جدا جدا قصبے تھے لیکن اب آبادی کی کثرت اور عمارات کی ترقی سے تینوں کے تینوں باہم مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اس آبادی میں مغربی رنگ بہت غالب ہے۔ توپخانہ

انتہائی مشرقی گوشے پر باسفرس کے بالکل کنارے پر آباد ہے۔ اور اسمیں زیادہ تر وہ فوجیں آباد ہیں جو دارالخلافہ کی حفاظت کے لئے مامور ہیں۔ غلط اور غلطہ کے اوپر پیرے میں زیادہ تر عیسائی اور ممالک یورپ کے باشندے آباد ہیں۔ تجارتی کاروبار زیادہ تر یہیں ہوتا ہے۔ یہاں کے تاجران یورپ کا بھی یہی مرکز ہے۔ اور تمام ممالک غیر کی سفارتیں باستثنائے ایران جس کی سفارت استنبول میں ہے یہیں ہیں۔ سلطان حال اور سلطان عبدالعزیز مرحوم کے مشہور محلات۔ باغات۔ فوارے۔ یوروپین سفرا کے مکانات نئی طرز کے ہوٹل اور مختلف جدید عمارات نے جو دریا کے کنارے دور تک مسلسل چلے گئے ہیں۔ اس حصہ آبادی کو عجیب رونق ودلکشی بخشی ہے۔ یہاں کے بازاروں میں سیر کرنے سے انسان چھوٹے پیمانے پر سارے یورپ کی سیر کرلیتا ہے۔ رات کے وقت جب دریا کے کنارے کی آبادیوں میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ اور ان کا عکس پانی میں پڑتا ہے۔ تو عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔

یہاں کی ٹنل بھی ایک خصوصیت کی جگہ ہے جو شہر کے ایک چھوٹے حصے میں زمین کے اندر اندر مسافروں کی ٹرین چلانے کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اس موقعہ پر چونکہ چڑھائی زیادہ چڑھنی پڑتی ہے اس لئے سڑک زمین کھود کر بنائی گئی ہے۔ جس کے ذریعہ لوگوں کی آمد ورفت جاری رہتی ہے۔ اور کل مسافت پانچ منٹ میں طے ہوجاتی ہے۔ یورپ میں زمین کی زیر سطح چلنے والی ٹرینوں میں انجن ہوتے ہیں

مگر ان ٹرینوں میں ایک رسّی سی بندہی رہتی ہے۔ جس کا تعلق ٹنل کے دونوں کناروں پر ایک ایک مشین سے ہوتا ہے۔ ان مشینوں سے اِسے حرکت دی جاتی ہے۔ اور وہ ایسی ہی تیز چلتی ہے جیسی کہ انجن والی ٹرین۔ اور کچھ ایسا اہتمام رکھا گیا ہے کہ جب ٹنل میں ریل چلتی ہے تو نہایت فرائے کی ہوا آتی ہے۔

پیرا کی پہاڑی پر ایک قدیم مینارہ دیدبانی ہے۔ اس پر سے قسطنطنیہ کی سیر نہایت عمدگی سے ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس منارہ کی ایک بڑی غرض ہی یہ بیان کی جاتی ہے۔ اسکی چوٹی پر سے چاروں طرف نگاہ دوڑ سکتی ہے۔ شہر کی تقسیم اور محلوں و بازار کی کیفیت خوب معلوم ہوتی ہے مشہور مقامات۔ محلات شاہی۔ عالیشان عمارتیں۔ مساجد۔ باغات۔ فواری باسفرس۔ شاخ زریں۔ قاضی کوئی۔ روشنی کے منارے۔ آتشزدگی کی نگرانی کے منارے۔ دار الضرب۔ توپخانہ کی عمارات۔ کشتیوں کے پل۔ جنگی بحری کارخانے۔ بحری شفاخانہ۔ آہن پوش جہازوں کا بیڑا۔ ممالک غیر کے جہازات۔ سبھوں کا مجموعی نقشہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ آجکل اس مینارے سے آتشزدگی کی نگرانی کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ اس کو پانچویں صدی میں بادشاہ ڈکورس نے جہازوں کی نگرانی کے واسطے تعمیر کیا تھا۔ اس کے بالمقابل استنبول میں جہاں آجکل ایڈریانوپل کی ریلوے کا سرا واقع ہے ایک اَور بہت بڑا مینارہ بنایا گیا تھا۔ جو اب منہدم ہو گیا ہے۔ ان دونوں میناروں کے درمیان ایک زنجیر بندہی رہتی تھی۔ جس سے شاخ زرین کی غیر مالک

کے جہازوں سے حفاظت مقصود تھی۔ اس طرح منارہ ان کوئیس اور میڈن ٹاور کے درمیان زنجیر باندھ کر آبنائے باسفرس کی حفاظت ہوتی تھی۔ مگر اس زمانے میں تارپیڈو کشتیوں اور سرنگوں کے ہوتے دقیانوسی طریقوں کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔

شہر کی مجموعی کیفیت

آبادی استنبول اور غلطہ دونوں کی آبادی ملاکر کوئی بارہ لاکھ کے قریب ہوگی۔ جس میں مسلمان۔ عیسائی اور یہودی سب قوموں کے لوگ آباد ہیں۔ مسلمان بمقابلہ دیگر قوموں کے غالباً دو تہائی ہوں گے۔

آب و ہوا یہاں کی آب و ہوا اکثر طبائع کے موافق اور صحت جسمانی کے واسطے بہت فائدہ مند ہے۔ مئی مہینہ میں جب میں اس جگہ آیا تو ہوا ایسی خوشگوار تھی جیسی ہمارے ہاں شملہ اور کشمیر کی ہوتی ہے۔ مگر موسم سرما کی نسبت لوگوں نے بیان کیا کہ جب تک کسی مکان میں ساری رات انگیٹھی نہ جلتی رہے وہاں شب گذارنا بہت مشکل ہے یہ عمدگی آب و ہوا کا نتیجہ ہے کہ یہاں ہر قسم کے لذیذ اور نفیس میوہ ہے مثل سیب۔ انگور اور امرود کے بکثرت اور ارزان دستیاب ہوتے ہیں۔

مسجدیں اس شہر میں مسجدوں کی تعداد قریباً پانسو ہے۔ جو عموماً بہت خوشنما اور عالیشان بنی ہوئی ہیں۔ اور سلاطین استنبول کی یاد تازہ کراتی ہیں جنہوں نے اپنے اپنے عہد سلطنت میں ان کی بنیادیں رکھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور جامع ایا صوفیا ہے۔

مدرسے استنبول میں دینی اور دنیوی تعلیم کے واسطے جو مدرسے بنائے گئے ہیں ان کی تعداد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مدارس قدیمہ پونے دوسو کے قریب اور مدارس جدیدہ پانسو سے زائد ہیں۔

کتب خانے مشرقی علوم کی قلمی اور نایاب کتابوں کا عظیم الشان ذخیرہ چوالیس کتب خانوں میں فراہم ہے۔ بعض کتب خانوں میں ایسی عدیم النظیر کتابیں ہیں کہ بلاد اسلامیہ میں شاید ہی اُن کا دوسرا نسخہ مل سکے۔

تکیے ارباب طریقت اور مختلف ملک کے مسافروں کے آرام و آسائش کے واسطے تین سو سے زائد تکیے اس شہر میں موجود ہیں جنکے مصارف کی تعداد امرائے قسطنطنیہ کی فیاضی کی زندہ مثال ہے۔

حمام استنبول میں دوسو کے قریب حمام ہیں۔ جن میں سے اکثر نفیس اور بہت شاندار ہیں۔ غسل۔ دلاکی اور خدمت کے جو طریق و آداب کہ مصر میں تھے وہی اسجگہ بھی ہیں۔ لیکن مصریوں کی طرح برہنہ غسل کرنے کی بدعادت اس جگہ بالکل نہیں حمام کے خدمتگار علی العموم نوخیز لڑکے ہوتے ہیں۔ جو اکثر ارمینیا اور بلاد نصاریٰ کے رہنے والے بیان کئے جاتے ہیں۔ ان کے باعث سے بعض حرکات ناشائستہ جو ظہور پذیر ہوتی ہیں وہ البتہ قابل اصلاح ہیں۔

ان حماموں کے علاوہ چند بحری حمام بھی ہیں جو سمندر کے کنارہ پر بنائے گئے ہیں۔ اور عمارت کی بجائے صرف لکڑیوں کے جنگلہ سے محدود ہیں طبی اصول کے لحاظ سے ان میں غسل کرنا خاص خاص بیماریوں کے دفعیہ کے واسطے بہت مفید ہے۔

ہوٹل قسطنطنیہ میں مختلف ملکوں کے باشندے بکثرت نظر آتے ہیں جن کو شوق تجارت کشاں کشاں یہاں لے آتا ہے۔ ان لوگوں کے قیام کے واسطے ہوٹل لوکندے اور خانات بکثرت موجود ہیں۔ جو نہایت آرام وہ طریق پر بنائے گئے ہیں۔ ہوٹلوں میں کھانے اور شب باشی دونوں کا پورا انتظام ہوتا ہے مگر لوکندے اور خان صرف شب باشی کا کام دیتے ہیں۔ کھانا بازار سے کھانا پڑتا ہے۔ یہاں کے لوکندے اور خانیں مصر کے لوکندوں اور وکالوں سے صفائی اور خوبی میں بڑھی ہوئی ہیں۔ اور کرایہ میں اُن کے برابر۔ جن لوگوں کو زیادہ عرصہ رہنا ہو وہ کرایہ کا مکان لے سکتے ہیں۔ یہاں کی خانوں میں بمقابلہ مصر کے وکالوں کے یہ بات زائد ہے کہ ہر خان کے ایک طرف کو قہوہ خانہ بھی ہوتا ہے جو خان سے ملا ہوا اور اسی کی عمارت کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

کھانے کا انتظام یہاں نانبائیوں کا انتظام بھی مصر سے بہتر ہے۔ وہاں کے نانبائی صرف مصریوں کے مذاق کا کھانا پکاتے تھے۔ مگر اس جگہ مصری۔ ایرانی۔ اور فرنگستانی تینوں وضع کے کھانے علیحدہ علیحدہ دستیاب ہوجاتے ہیں۔ یہاں کے بعض نانبائیوں نے اس قدر ترقی کی ہے کہ جب مسافر میز کے سامنے بیٹھ جاتا ہے تو کھانوں کی ایک فہرست اُسکے آگے رکھدیتے ہیں۔ جس میں جملہ اقسام کے موجودہ کھانوں کے نام اور قیمت درج ہوتی ہے۔ اور ایک چھاپہ شدہ کاغذ بھی رکھدیتے ہیں۔ جس میں کھانے اور قیمت کا عنوان درج اور باقی تمام کاغذ سفید ہوتا ہے۔ جب مسافر کوئی چیز مانگتا ہے تو نوکر اس چیز کو میز پر لاکر رکھدیتا ہے۔ اور جلدی سے سفید کاغذ پر کھانا اور اسکی قیمت بھی لکھدیتا ہے

تاکہ مسافر کو ساتھ ساتھ معلوم ہوتا جائے کہ اُس نے اب تک کتنی قیمت کا کھانا کھایا

سواری سواری کا انتظام اس جگہ تسلی بخش ہے۔ استنبول اور غلطہ دونو میں علیحدہ علیحدہ ٹریموے بنی ہوئی ہے۔ جو گھوڑوں کی مدد سے چلتی ہے۔ مگر مصر و اسکندریہ کی ٹریموے سے خوبصورتی اور تیز روی میں کم ہے۔ بڑے بڑے چوکوں پر سواری کے گھوڑے زین کئے ہوئے موجود رہتے ہیں۔ اور مسافروں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہونچا دیتے ہیں۔ سائیس ہر وقت گھوڑے کے ساتھ رہتا ہے۔ ان دونوں کے علاوہ گھوڑا گاڑیاں بھی بکثرت مل جاتی ہیں۔ گھوڑے ایسے مضبوط ہوتے ہیں کہ اُتار چڑھاؤ میں بڑی تیزی سے دوڑتے چلے جاتے ہیں۔

مضافات شہر باسفورس کے دونوں کناروں اور گولڈن ہارن کے جنوب تک قریباً ۲۰ چھوٹی چھوٹی آبادیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ جو قسطنطنیہ کے مضافات میں شمار ہوتی ہیں۔ یہ آبادیاں ایک دوسری سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر واقع ہیں۔ اور ہر آبادی میں ہوٹل۔ قہوہ خانے۔ تکیے۔ موجود ہیں۔ اور جملہ ضروری چیزیں ان جگہوں میں ملجاتی ہیں۔ بعض آبادیوں میں قدرتی چشمے ایسے موجود ہیں جن کا پانی نہایت میٹھا۔ ٹھنڈا۔ خوشگوار۔ اور ہاضم ہوتا ہے۔ بعض چشموں کا پانی بوتلوں میں بند ہوکر یوروپ کو جاتا ہے آب وہوا کی عمدگی کی وجہ سے قسطنطنیہ کے لوگ اکثر جمعہ اور اتوار کو ان مقامات میں تفریح کی غرض سے چلے آتے ہیں۔ ان میں سے اُسکدار۔ قاضی کوئی۔ بیکر بک۔ سلطان الیوب مشہور جگہیں ہیں۔

پل کا نظارہ استنبول اور غلطہ میں آمد و رفت کا سلسلہ جاری رکھنے کی غرض سے کشتیوں کے دو چوبی پل شاخ زرین پر بنے ہوئے ہیں۔ ترک ان کو "کوپری" کہتے ہیں۔ شمالی پل پر عبور کرنے والوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے پل پر قدم دھرتے ہی لوگوں کی رواروی دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی بڑے ضروری کام کے واسطے ایک طرف سے دوسری طرف جا رہے ہیں۔ انکی مختلف رنگتیں اور جداگانہ لباس دیکھنے سے ایک عجیب سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ کوئی عربی النسل سفید عمامہ باندھے ہوئے ہے۔ اس کے برابر ایک سیاہ رنگ کا حبشی گذر رہا ہے۔ ذرا پیچھے ہٹکر دیکھو تو کوئی بخاری بڑا سا صافہ باندھے ہوئے چل رہا ہے۔ ایرانی ایک اونچی اور سیاہ ٹوپی پہنے ہوئے خوش خرام جا رہا ہے۔ یونانی سفید شلوار اور سنہری حاشیہ دار اسکٹ پہنے ہوئے اپنی زرق برق دکھلا رہا ہے۔ چرکس پیش قبض لگائے چھاتی پر کارتوس جمائے اور تلوار کو پرتلہ مین لٹکائے ہوئے جا رہا ہے۔ یوروپین لوگ فرنگی وضع کی سادہ ٹوپیاں اوڑھے ہوئے گذر رہے ہیں۔ غرض مختلف ملکوں کے مرد عورت اور بچے اس کثرت سے دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے اجتماع سے کسی بڑے جلسہ یا میلہ کا گمان پیدا ہوتا ہے۔ ہر مسافر کو ایک دفعہ کے عبور کے واسطے آدھ آنہ محصول دینا پڑتا ہے۔ گھوڑا گاڑی کی میر بجری فی عدد پانچ آنے ہے پل سے عبور کرنے والوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ میر بجری کا روزانہ محصول قریبًا پانچہزار روپیہ تخمینہ کیا گیا ہے۔ اس آمدنی کی نسبت ایک باخبر شخص نے مجھے کہا کہ یہ روپیہ یتیم خانوں اور غریب خانوں میں صرف ہوتا ہے

وسط پل پر پہونچنے سے جب گولڈن ہارن پر نگاہ پڑتی ہے تو اس سے بھی نہایت دلکش نظارہ دکھائی دیتا ہے۔ خصوصاً جب دھوپ نکل رہی ہو تو اور بھی لطف انگیز اور مسرت خیز معلوم ہوتا ہے۔ آفتاب کی سنہری کرنوں کی جگمگاہٹ مساجد کے طلائی گنبدوں کی چمک۔ سفید اور شفاف میناروں کا عکس عالیشان محلوں کی سنگ مرمری چمکدار پیشانیاں۔ مکانوں کی بادامی رنگ کی حقیر اور زرد رنگ کے چوبی جھروکے سرو صنوبر کی قطاریں۔ پہاڑیوں کے گھنے سبزہ زار۔ یہ سب چیزیں اپنے دلفریب نظاروں سے ایسا سماں باندھ دیتی ہیں کہ دیکھنے والے پر ایک محویت طاری ہو جاتی ہے۔

پل کے دونوں طرف کشتیوں سے ملے ہوئے گولڈن ہارن کے قہوہ خانے ہیں جہاں عربی ہوا سے تازگی حاصل کرنے کے واسطے اکثر لوگ آتے رہتے ہیں۔ ان کی تفریح کے واسطے چاء اور میوہ جات یہاں موجود رہتے ہیں۔

سلاملق

استنبول پہونچنے کے بعد میری پہلی آرزو یہ ہوئی کہ خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم عبدالحمید خان کا وہ جلوس شاہانہ دیکھا جائے جو سلاملق کے نام سے مشہور اور ہر جمعہ کو مسجد میں جانے کے وقت ہوا کرتا ہے۔ سلطان المعظم جمعہ کی نماز جامع مسجد حمیدیہ میں پڑھتے ہیں جو سرائے یلدوز (قصر سلطانی) کے قریب ہے۔ اور استنبول سے قریباً دو میل کے فاصلہ پر غلطہ کے ایک حصہ بشکتاش

میں واقع ہے۔

میں نے یہ جلوس دیکھنے کی غرض سے ایک نیا سوٹ سلا سلایا سے میں بازار سے خریدا۔ اور سر پر ٹسر کا دوپٹہ باندھا۔ اور ایک ہندی مسافر کی حیثیت سے گیارہ بجے کے قریب جامع حمیدیہ میں جا پہونچا۔ اس موقعہ پر ٹسر کے دوپٹہ نے وہ کام دیا کہ شاید کسی بڑے آدمی کی سفارش بھی اس سے زیادہ کام نہ دے سکتی۔ جب میں جامع حمیدیہ میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ تو ایک صاحب میرے پاس آئے۔ اور میرے عمامہ کی بندش دیکھ کر اردو میں فرمانے لگے۔ کیا آپ ہندوستانی ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ ہاں۔ پھر پوچھا کہ یہاں کس غرض سے آنا ہوا۔ میں نے کہا کہ دارالخلافہ اسلامی کی سیر۔ اور سلطان المعظم کا شوق دیدار مجھے اس سرزمین میں کھینچ لایا ہے۔ یہ تقریر سنکر وہ نہایت مہربانی سے مجھے امام مسجد کے پاس لے گئے۔ اور میرے سفر کے حالات بیان کر کے ان سے شناسائی کرائی۔ اور سفارش کی کہ مجھے رسم سلاملق کے دیکھنے کا موقعہ دیا جائے۔ امام صاحب نے قہوہ کی تواضع کی۔ اور عربی زبان میں میرے سفر کے حالات دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد مجھے گیلری پر نماز پڑھنے کی اجازت دی تاکہ میں وہاں سے بخوبی سیر کر سکوں۔ اس گیلری میں بڑی بڑی کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں۔ جہاں سے دور تک نگاہ چلی جاتی ہے۔ اور اس سے بہتر موقعہ مسجد میں سلاملق کی سیر کا اور نہیں ہے۔ کیونکہ جب سلطان المعظم کی سواری آنے کو ہوتی ہے۔ تو مسجد کے منتظمین نماز پڑھنے والوں کو مسجد میں داخل کر کے مسجد کے دروازے بند کر دیتے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی آدمی سلاملق کا جلوس نہیں دیکھ سکتا۔

یہ صاحب جو مجھے امام صاحب کی خدمت میں لے گئے۔ اور مجھے ایسے عمدہ موقعہ ملجانے کا باعث ہوئے۔ ان کا نام ڈاکٹر امیر علی ہے۔ جو صوبہ بہار کے رہنے والے اور شاہی ڈیوڑھی میں ڈاکٹری کے عہدے پر ممتاز ہیں۔ غرضیکہ ڈاکٹر امیر علی کی مہربانی سے مجھے گیلری میں جگہ ملی۔ ڈاکٹر صاحب بھی میرے ساتھ تھے۔

مسجد کے ارد گرد عجیب منظر پیش نظر تھا۔ ایوان شاہی سے جامع حمیدیہ تک ہر قسم کی فوج بحری۔ بری پلٹنیں۔ رسالے۔ توپخانے۔ سفرمینا۔ عربوں ترکوں اور کردوں کے جدا جدا دستے کے دستے راستہ کے دونوں طرف زرق برق وردیاں زیب بدن کئے ہوئے نہایت شان سے کھڑے ہوئے تھے۔ مسجد کے آگے کے میدان میں دور تک فوجیں ہلال کی شکل میں صفیں باندھے دیدار سلطانی کے اشتیاق میں مثل دیوار کے کھڑی تھیں۔ مسجد کا صحن پاشاؤں یاوردن اور ہر قسم کے عہدہ داروں سے جو زرق برق وردیاں پہنے ہوئے تھے بھر گیا۔ صرف سلطان المعظم کی گاڑی اور اُن کے ہمرکاب افسران کے لئے جگہ باقی تھی۔ بارہ پر کچھ منٹ گذرے تھے کہ فوجوں میں "پادشاہم چوق یشا" کے نعرے بلند ہونے شروع ہوئے جس سے میدان گونج اُٹھا۔ گونج کے کم ہوتے ہی موذن نے آذان دینی شروع کی۔ رجمنٹوں کے بینڈ جو اب تک باری باری بج رہے تھے سب بند ہو گئے۔ یہ اذان گویا سلطان المعظم کے قصر شاہی سے روانہ ہونے کی علامت تھی۔ اتنے میں پاشاؤں کی لمبی لمبی قطاریں نمودار ہوئیں جو جلوس کے اگلے حصے میں تھے

انکی چھاتیوں پر اس قدر تمغے آویزاں تھے کہ ان کی چمک سے وردیوں پر نظر نہیں ٹھر سکتی تھی۔ یہ لوگ سڑک کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے کے پیچھے قطار باندہے ہوئے محل سلطانی سے آکر مسجد کے دروازہ پر ٹھر گئے۔ اور جو لوگ پہلے سے وہاں منتظر کھڑے تھے اُن کے آگے صف باندہکر کھڑے ہو گئے۔ ان کے بعد چند معزز عہدہ دار گذرے۔ جنکی نسبت ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یہ وزراء ہیں۔ اس کے چند منٹ بعد سلطان المعظم کی گاڑی آئی گاڑی کی آہٹ سنتے ہی ”حمیدیہ ترانہ“ کی سریں بلند ہونی شروع ہوئیں گاڑی سرتاپا طلائی اور سبز میناکاری کے کام سے آراستہ تھی۔ سلطان المعظم ایک سادہ فوجی کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سینہ پر کوئی تمغہ یا نشان کسی قسم کا نہیں تھا۔ صرف ایک خمدار تلوار کمر پر بندہی اور سر پر باقی لوگوں کی مانند ترکی ٹوپی آپ کے مقابل غازی عثمان پاشا شیر پلونا تھے۔ گاڑی آہستہ آہستہ مسجد کے سامنے فوجوں کی صفوں میں سے گذرتی ہوئی بائیں جانب آپہونچی۔ اور سلطان المعظم گاڑی سے اُتر کر مسجد کے مقصورہ میں داخل ہو گئے۔ جو اِسی غرض سے بنایا گیا ہے۔ اور اس کے دروازے بند کر لئے گئے۔ اس کے جواب میں داہنی جانب ایک دوسرا مقصورہ ہے جس میں سلطان المعظم کے وزراء اور ہمراہی نماز پڑھتے ہیں۔

یہ ساری احتیاطیں سلطان المعظم کی جان کی حفاظت کے لئے کیجاتی ہیں۔ بادشاہوں کی جان یوں تو عموماً مخدوش حالت میں رہا کرتی ہے مگر یورپ میں آئے دن انارکسٹوں کی دست درازیوں سے یہ خدشہ بہت

بڑھ گیا ہے اور یوروپ کے سلاطین گویا ایک ملح کی قید میں رہا کرتے ہیں جیسے وہ بخوشی اپنے لئے پسند کرتے ہیں۔ جب سے نامراد "ینگ ٹرکش پارٹی" نے اپنا منحوس چہرہ دکھانا شروع کیا ہے ترکی میں بھی اس قسم کی بندشوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی ہے۔

خطبہ میں یہاں ایک بات نئی یہ دیکھنے میں آئی کہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد خطیب خاموش ہو جاتا ہے۔ اور شاہی غلام جو مسجد کی گیلری میں ہوا کرتے ہیں اور اسی غرض سے تعینات ہیں۔ آوازیں ملا کر کچھ پڑھنے لگتے ہیں۔ یہی غلام مکبری کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

بعد اختتام نماز سلطان اپنے حجرے سے نکلے اور زینہ پر ایک ایسی جگہ جہاں سے سامنے کے میدان کی خوب سیر ہو سکتی تھی کھڑے ہو کر فوج کو ملاحظ کرنے لگے۔ فوجوں نے ان کے سامنے سے مارچ پاسٹ کرنا یعنے اصول جنگی قواعد کے ساتھ گذرنا شروع کیا۔ عجیب کیفیت نظر آتی تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا ایک سمندر ہے جو لہریں مار رہا ہے۔ جتنی فوجیں رسم سلاملق کے لئے اس میدان میں حاضر ہوئی تھیں۔ وہ سب جب سلطان المعظم کے سامنے سے گذر گئیں۔ تو آپ اپنے ہمراہیوں کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئے۔ اور ایوان شاہی کی طرف روانہ ہوئے۔ آتے جاتے ان فوجوں کے علاوہ جو راستہ کا دونوں طرف سے احاطہ کئے رہتی ہیں رسالہ کا کچھ حصہ نہایت قیمتی وردیاں پہنے ہوئے اور معزز اراکین گھوڑوں پر سوار آپکے ہمرکاب بھی ہوتے ہیں

اس رسم کے حالات یورپ کے ملکوں میں بڑی عزت سے سنے جاتے ہیں اور یوروپین امرا کمال شوق سے یہ مشرقی شاہانہ جاہ وجلال دیکھنے کے شائق ہوتے ہیں۔

ان لوگوں کی خاطر جامع حمیدیہ کے مقابل حسب الحکم سلطانی ایک بالاخانہ بنایا گیا ہی جہاں یوروپ کے سیاح اپنے اپنے سفیروں سے ٹکٹ حاصل کرکے داخل ہوتے ہیں۔ اور بالاخانہ کی کھڑکیوں میں بیٹھکر اس عظیم الشان نظارہ کا تماشا دیکھتے ہیں۔

سلاملق کی رسم ترکوں میں بہت عرصہ سے جاری ہے۔ اور ہر جمعہ میں اس رسم میں حصہ لینے کے لئے نئی فوج سلطنت عثمانیہ کے دُور دراز گوشوں سے طلب کی جاتی ہے۔ ایک سیاح کے نزدیک تو بجز جاہ وجلال اور سلطانی شان وشوکت کا تماشا دیکھنے کے اس میں اَور کوئی بات نظر نہیں آتی۔ مگر سلطنت کے لئے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ فوجیں ایک جگہ پڑی پڑی سُست نہیں ہونے پاتیں۔ بلکہ ہمیشہ نقل وحرکت میں رہنے کے باعث چست وچالاک وجفاکش رہتی ہیں۔ اور سلطان المعظم کو اپنی کُل فوج کے معائنہ اور ان کی حالت کے اندازہ کرلینے کا پورا موقعہ ملتا رہتا ہے۔ فوج میں بھی ہر وقت مشاہدہ سلطانی کے خیال سے وہ جوش جان نثاری پیدا ہوتا رہتا ہے جو مشرقی قوموں کے دلوں میں اپنے بادشاہ کو دیکھکر موجزن ہو جایا کرتا ہے۔

مساجد

استنبول میں سب سے پہلے جو مسجد تعمیر ہوئی وہ جامع فاتح ہے جو سلطان ابوالفتح محمد خان فاتح قسطنطنیہ نے بنوائی تھی۔ اس کے بعد کچھ ایسی رسم پڑگئی کہ ہر ایک فرمانروا ایک ایک عالیشان جامع بنواکر اپنی شان خلافت کا اظہار کرتا رہا ہے قسطنطنیہ کی مسجدوں کی سیر کرنے سے ایک سیاح مسلمانوں کے ہر زمانے کی عمارت کا مطالعہ کرسکتا ہے۔ کیونکہ کوئی زمانہ ایسا نہیں جس کی ایک نہ ایک یادگار مسجد کی شکل میں یہاں موجود نہ ہو۔

جامع ایا صوفیا استنبول کی مسجدوں میں سب سے زیادہ مشہور قدیم اور عالیشان جامع ایا صوفیا ہے۔ جو دراصل رومی عیسائیوں کا گرجا تھی۔ ابتداءً اس کو قسطنطین اعظم نے اپنے عہد حکومت میں تعمیر کیا تھا۔ پھر ایک دفعہ تباہ ہو جانے کے بعد قیصر جسٹین نے ۵۳۲ھ میں اسکی بنیاد نئے سرے سے ڈالی۔ ۸۵۷ھ (۱۴۵۳ء) میں محمد فاتح نے اسکو ضروری ترمیم کے بعد مسجد بنالیا۔

ایا صوفیا کے عالیشان ہونے کا اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ ۱۰۰۔ انجنیروں کی نگرانی میں دس ہزار مزدور ۱۰ برس تک اسکی تعمیر میں مصروف رہے۔ اور ڈیڑھ کروڑ روپیہ اس پر صرف ہوا۔ اسکی شکل مثل یونانی کلیسیا کی صلیب کے ہے۔ طول ۲۷۰ قدم اور عرض ۲۴۵ قدم ہے۔ اس عمارت میں داخل ہوکر سب سے پہلے انسان اسکی وسعت کو دیکھکر متحیر ہوتا ہے۔ پھر اسکی نگاہ اس کے عالیشان گنبد پر پڑتی ہے۔ اور اس کے ارتفاع اور

پھیلاؤ کو دیکھکر حیران ہوجاتا ہے۔ عجیب شاندار عمارت ہے۔ جس میں ایک ہی گنبد ہے۔ جو اتنا وسیع ہے کہ ہزاروں آدمی اس کے نیچے سماجاتے ہیں۔ اس گنبد کا قطر ۱۱۵ فٹ اور چھت کا ارتفاع ۱۸۰ فٹ ہے۔ گنبد کی گولائی ایسی بتدریج ہے کہ باوجود اس پھیلاؤ کے اس کا عمق ۴۴ فٹ سے زیادہ نہیں ہونے پایا۔ ۱۷۰ استون ہیں۔ جن میں سے بعض سنگ رخام بعض زبرجد اور بعض سنگ سماق وغیرہ کے ہیں۔ اور جن کا قطر تین تین چار چار ہاتھ سے کم نہیں۔ دیواریں اور گنبد کسی وقت نیچے سے اوپر تک بیل بوٹوں سے ڈھنپے ہوئے تھے۔ اور گنبد کے نیچے جرائیل۔ میکائیل۔ اسرافیل اور عزرائیل فرشتوں کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ یہ تصویریں تو اب بھی نمودار ہیں مگر باقی کل نقش و نگار پر چونے کا پلاسٹر پھیر دیا گیا ہے۔ گنبد کے گرد ایک گیلری بنی ہوئی ہے۔ جس پر سے مسجد کی سیر کرنے میں عجیب کیفیت نظر آتی ہے۔ مسجد کا دروازہ تانبے کے پتروں سے منڈھا ہوا ہے۔ جن پر گذشتہ زمانہ کی تصویروں کے نشان اب تک نمایاں ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت قسطنطین اعظم کی یادگار ہے۔

اس عمارت کے لئے مصر شام اور یونان کی تمام قدیم عمارتوں سے مصالحہ منگایا گیا تھا۔ اس لئے اس کو مختلف ممالک اور مختلف زمانوں کی صنعت کا مجموعہ سمجھنا چاہئے۔ کاریگروں نے ان مختلف عناصر کو اس عمدگی اور خوبی سے اپنے اپنے موقعہ پر لگایا ہے کہ ان کے مجموعہ سے ایک خاص شان پیدا ہوگئی ہے جو آثار قدیمہ کے مطالعہ کرنیوالوں کی بڑی دلچسپی کا باعث ہے

مسجدوں کی عام حالت

قسطنطنیہ کی ساری مسجدیں قریباً اسی نمونہ کی ہیں۔ اور یہ وضع ہندوستان کی وضع سے بہت مختلف ہے۔ یہاں صحن۔ دالان اور محرابیں نہیں ہوتیں۔ ہر مسجد میں کئی سو بتیوں کے آہنی جھاڑ ہوتے ہیں۔ آراستگی ایسے پر تکلف ساز و سامان سے کی جاتی ہے، جو یورپ کے مشہور گرجا گھروں سے کسی صورت میں کم نہیں ہوتی۔ مستورات کے نماز پڑھنے کے لئے بائیں طرف جگہ بنی ہوئی ہوتی ہے۔ حوض کا رواج نہیں۔ بلکہ ایک کونہ پر سقاوے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن میں وضو کے لئے لوٹنیاں لگی رہتی ہیں۔ اِن مساجد کے متعلق عموماً جدا جدا جائداد وقف ہیں۔ جن سے ان کے مصارف چلائے جاتے ہیں۔ اور خیرات کے کام بھی جاری کئے جاتے ہیں۔ مثلاً جامع سلطان مصطفے سے غربا و مساکین اور طلباء کو کھانا تقسیم کیا جاتا ہے۔

مقامات قابل دید

قسطنطنیہ اور اُس کے مضافات میں بہت سے قدیم و جدید مقامات ایسے ہیں۔ جو سیاح کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ اور جن کی سیر کئے بغیر قسطنطنیہ کی سیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اکثر سیاح ان مقامات کی سیر میں "مرے یا "بریڈمتا" یا کسی اور مشہور گائڈ بک سے مدد لیتے ہیں۔ مگر ان مقامات کی سیر کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ قسطنطنیہ پہونچکر کسی لائق اور شریف ترجمان کو جو چار روپیہ یومیہ پر مِل جاویگا ملازم رکھ لے۔ اس ترجمان سے سیر کے علاوہ

خرید و فروخت میں بھی بڑی مدد ملیگی۔ مگر مجھے ترجمان یا گائڈ کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ میں ایک عرصہ تک وہاں پر مقیم رہا۔ اور اس عرصہ میں اکثر عربوں اور ایرانیوں سے شناسائی پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے ان کے ذریعہ سیر کا خوب موقعہ ملتا رہا۔

آت میدان مسجد ایا صوفیا کے باہر ۹۰۰ فٹ لمبا اور ۴۵۰ فٹ چوڑا ایک وسیع و ہموار میدان ہے۔ جسے آت میدان یا انگریزی میں ہپوڈرام کہتے ہیں۔ اس میدان کے ایک طرف سنگ رخام کی ایک چمکدار مصری لاٹھ ۵۵ فٹ بلند ہے۔ اور مصر کے قدیم با تصویر خط کی عبارت سے پُر ہے۔ یہ لاٹھ قدیم زمانہ میں مصر سے یہاں لائی گئی تھی۔ میدان کے دوسری طرف اس سے بلند اور چھوٹے پتھروں کی ایک لاٹھ ہے۔ جس کے بالائی سرے پر پتھر کی جھاڑیاں اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ قدامت کے اعتبار سے ہزاروں انقلاب اس کے سر پر سے گذر چکے ہیں۔ کئی جگہ اس پر گولوں کی ضربوں کے نشان نظر آتے ہیں۔ اور ان صدموں کے باعث کئی جگہ سے پتھر اُڑ گیا ہے۔ اس کا بنانیوالا افسوس ہے کہ گمنامی کی خاک میں چھپا ہوا ہے۔ اور مورخین اس کا پتہ چلانے سے قاصر ہیں۔ کہ یہ ستون کس غرض سے تعمیر کیا گیا۔ اور کن معماروں کی اُستادی کا نمونہ ہے۔

قلعہ کسنی آت میدان سے ملا ہوا ایک عظیم الشان حوض ہے۔ جو ٹھوس پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اور قلعہ کسنی کے نام سے مشہور ہے۔ اس حوض کی محرابدار چھت سنگ مرمر کے بیشمار ستونوں پر قائم ہے جنکی تعداد ۱۰۰۲ بیان کی جاتی ہے۔ لیکن اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہر ایک ستون چونکہ اوپر تلے تین تین

قطاروں میں گنا جاتا ہے اغلب ہے کہ انکی اصلی تعداد ۴۳۳ سے زائد نہ ہو گی اس عجیب وغریب عمارت کی ساخت کا ٹھیک سبب معلوم نہیں ہوا۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حوض دراصل تہ خانہ تھا اور تغیر زمانہ سے بیکار ہوکر پانی کا ذخیرہ قرار پاگیا۔ بہرکیف کچھ ہی ہو آجکل تو اس میں ملبہ اور کوڑا کرکٹ ڈالا جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت اس کا کچھ حصہ مٹی سے پُر ہو گیا ہے۔ اگر اسکی طرف سے سلطنت کو یہی استغنا رہا تو یقین ہے کہ یہ حیرت میں ڈالنے والا تہ خانہ جو بڑی محنت سے ٹھوس پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے مٹی سے پُر ہو جائے گا۔

عجائب خانہ

استنبول کا پُرانا عجائب خانہ تو ایک عرصہ سے قائم ہے جسمیں زمانہ گذشتہ کے فوجی افسروں کے بُت اپنے عہد کا لباس پہنے ہوئے اور پُرانے اسلحہ سے آراستہ کھڑے ہیں۔ مگر اُنیسویں صدی کے آخری نصف میں جو نیا عجائب خانہ قائم ہوا ہے وہ بہت ہی عجیب ہے۔ اس میں زمانہ قدیم کی سنگی تعویذوں کے علاوہ بیشمار ایسی نادر چیزیں فراہم کی گئی ہیں۔ جو دُنیا کے سیاحوں کی بہت کچھ دلچسپی کا باعث ہیں۔ سب سے اول فتح احمد پاشا نے ۱۸۴۵ء میں چند پُرانے سکے اور اشیاءِ قدیمہ بہم پہونچا کر سینٹ اسرین کے گرجا میں جمع کیں۔ پچیس برس بعد صبحی پاشا نے جو کچھ عرصہ کے لئے محکمہ تعلیم کے افسر اعلیٰ رہ چکے تھے۔ اور خود بھی سکہ جات قدیمہ کے مبصّر تھے اِن چیزوں کو قدیمی محلسرائے میں منتقل کرا دیا۔ اس کے تھوڑے دنوں بعد حمدی بک کو اشیاء قدیمہ اور خصوصًا پُرانی قبروں کے سنگی تعویذوں کی تلاش کا شوق پیدا ہوا۔ اسکی سعی اور موجودہ سلطان کی سرپرستی اور امداد سے آثار قدیمہ کی دستیابی میں خوب

ترقی ہوئی جس کے واسطے محل سرا کے مقابل ایک خاص عمارت بنانی پڑی۔ یہی وہ عجائب خانہ ہے جس کو دیکھکر پروفیسر میکس مولر جیسے مشہور عالم نے ترکوں کی علمی ترقی کا اعتراف بلا عذر کیا ہے۔ قدیم زمانہ کے جو تعویذ صیدا وغیرہ شہروں سے بہم پہونچائے گئے ہیں اُنمیں ایک تعویذ کی نسبت یہ خیال ہے کہ وہ اسکندر اعظم کا تابوت ہے۔

اس سلسلہ میں خزانہ بھی قابل ذکر ہے جو ایک قسم کا عجائب خانہ ہے اور جہاں تمام گذشتہ سلاطین عثمانی کی قدآدم تصویریں معہ اصلی لباس واسلحہ وغیرہ ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں۔

باب عالی استنبول کا وہ سلسلۂ عمارات ہے جس میں ٹرکی گورنمنٹ کے وزراء سلطنت کاروبار کرتے ہیں۔ یہ عمارتیں کچھ ایسی شاندار نہیں ہیں۔ بلکہ چند بے ڈول اور پرانی عمارتوں کا سلسلہ لمبا چلا گیا ہے۔ ان کی عظمت جو کچھ ہے وہ یہی ہے کہ سلطنت کے اعلیٰ فرائض کی انجام دہی انہی دفاتر میں ہوتی ہے۔ اسکو انگریزی میں سُبلائم پورٹ کہتے ہیں۔

سرائے یلدز ایک عالیشان اور بارونق محل ہے جو غلطہ کے ایک عمدہ موقعہ اور باسفرس کے دلفریب ساحل بشکتاش کے ایک حصہ میں واقع ہے۔ ممالک عثمانیہ کے موجودہ فرمانروا سلطان عبدالحمید خان ثانی اسی محل میں قیام فرماتے ہیں۔ اسی جگہ مابَین ہمایونی کا دفتر ہے۔ جس میں باب عالی کی رپوٹیں وصول ہوکر باش کاتب کے ذریعہ سلطان المعظم کے حضور میں پیش ہوتی ہیں۔ اور صدور حکم کے بعد برائے نفاذ باب عالی میں واپس جاتی ہیں۔

مقبرہ حضرت ایوب انصاری

قسطنطنیہ کے عجائبات میں ایک دلچسپ نظارہ حضرت (خالد) ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی قبر مبارک ہے۔ یہ جلیل القدر صحابی مدینہ منورہ کے رہنے والے تھے۔ جب رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو تا تیاری مسجد نبوی آپ ہی کے مکان پر فروکش رہے۔ ۵۰ھ میں جب امیر معاویہ نے ایک لشکر جرار رومیوں پر جہاد کے واسطے روانہ کیا تو آپ اس لشکر میں شامل ہوئے۔ ایام محاصرہ قسطنطنیہ میں بیمار رہکر ۵۱ھ یا ۵۲ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ اور قسطنطنیہ کے قریب دفن ہوئے۔ آپ کا مقبرہ بڑی شان وشوکت کا ہے اسکی موجودہ عمارت سلطان ابوالفتح محمد خان فاتح قسطنطنیہ نے ایک ولی کامل کی نشاندہی سے بنوائی تھی۔ جس جگہ یہ مقبرہ بنایا گیا ہے۔ وہ محلہ بناسبت ذات گرامی سلطان ایوب کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ عام وخاص زیارت کے واسطے جاتے ہیں۔ اور انوار قدسیہ سے مستفید ہوتے ہیں۔ زائرین کا مجمع صبح وشام لگا رہتا ہے۔ ایک مرتبہ میں بھی زیارت کے واسطے گیا تھا۔ مولوی نورالدین صاحب تاجر کتب مصریہ مقیم کانپور کی خاص تاکید تھی کہ میں وہاں پر ان کے لئے دعا مانگوں۔ دخانی کشتی کے ذریعہ آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ اور خلیج قسطنطنیہ کے انجام پر ہے۔ مقبرہ کے اندر مطلاّ قرآن مجید بیش قیمت اور نہایت خوشخط رحلوں پر ہر طرف سلسلہ وار رکھے ہوئے اور دیواروں پر خوشخط قطعات جلی حروف میں لکھے ہوئے آویزاں ہیں۔ جن میں آیات قرآنیہ اور ادعیہ ماثورہ مکتوب ہیں۔

مقبرہ کے احاطہ میں دو تین درخت اس قدر عظیم الشان ہیں کہ ہر ایک کا محیط بیس پچیس گز سے کم نہ ہوگا۔ کبوتروں کے کابک ان درختوں پر رکھے ہوئے ہیں۔ غلہ فروش غلہ کا صندوق بھرے ہوئے موجود رہتا ہے۔ زائرین اسے کچھ دیتے ہیں تو وہ غلہ بقدر قیمت کے کبوتروں کے آگے ڈال دیتا ہے۔

مقبرہ کے مشرق کو ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ جو جامع سلطان ایوب کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان محمد فاتح کے زمانہ سے سلاطین عثمانیہ کی گدّی نشینی کی رسم اسی مسجد میں ادا ہوتی ہے۔

تکیئے

قسطنطنیہ میں بسر کرنے سے یہاں کے امرا کی فیاضی کا ایک ثبوت یہ نظر آتا ہے کہ شہر میں تین سو سے زائد تکیئے ہیں۔ جو مسکینوں، مسافروں۔ اور ارباب طریقت کی سکونت کے لئے وقف ہیں۔ بعض میں ایک وقت اور بعض میں دونوں وقت کا روزانہ کھانا اور قہوہ انہیں مفت ملتا ہے۔ مختلف ممالک کے باشندوں کے لئے جدا جدا تکیئے ہیں۔ مثلاً ہندوستانی تکیہ۔ بخاری تکیہ۔ مغربی تکیہ وغیرہ۔ علاوہ ازیں کچھ تکیئے بالکل اصحاب طریقت سے مختص ہیں۔ مثلاً تکیہ قادریہ۔ تکیہ نقشبندیہ۔ تکیہ مولویہ۔ تکیہ رفاعیہ۔ مگر ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک کے تکیہ میں نہیں رہ سکتا۔ اور نہ کسی خاص فرقہ صوفیہ کا مرید دوسرے اصحاب طریقت میں قیام کر سکتا ہے۔

ان تکیوں کی عمارتیں عموماً خوشنما اور خوش فضا ہیں۔ ہر تکیہ میں ایک مختصر سی مسجد بھی ہوتی ہے۔ بعض مسجدیں شیشہ آلات اور قیمتی فرش فروش سے اس عمدگی کے ساتھ آراستہ کی گئی ہیں کہ ان کو دیکھکر طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ہر تکیہ میں ایک شخص شیخ التکیہ اُس ملک یا اُس فرقہ کا ہوتا ہے جس ملک یا فرقہ کے نام سے وہ تکیہ موسوم ہے +

اِن تکیوں کا خرچ اوقاف کی آمدنی سے چلتا ہے جن کے واسطے امرا نے جائدادیں وقف کر رکھی ہیں۔ اِن کا انتظام گورنمنٹ ٹرکی کے محکمہ اوقاف کے متعلق ہے اور وہی روپیہ وصول کر کے مستحقین میں تقسیم کرتا ہے۔ اِس کے سوا سلطان المعظم بھی وقتاً فوقتاً مختلف تکیوں کی بہت فیاضی کے ساتھ امداد کرتے رہتے ہیں۔ اِن وجوہ سے یہ تکئے علی العموم عمدہ حالت میں دکھائی دیتے ہیں +

مجھے مختلف اوقات میں چند تکیوں کے دیکھنے کا اتفاق ہُوا۔ وہ بیشتر آباد ہیں اور اِن میں رہنے والے مزہ سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض شیوخ کی نسبت یہ شکایت ہے کہ جو رقم تکیہ کے لئے اُنہیں ملتی ہے اُس کا بڑا حصّہ وہ خود کھا جاتے ہیں اور اہل تکیہ کے آرام و آسایش میں بہت تھوڑا خرچ کرتے ہیں۔ یہ شکایت کُلّیہ طور پر غلط ہو یا صحیح لیکن ہندی تکیہ کی حالت دیکھکر مجھے اِس کی صحت میں کچھ شک نہیں رہا۔ اِس تکیہ کی حالت ابتر ہے تحسین آفندی شیخ التکیہ کو مسافروں سے ہمدردی کم ہے اور بیشتر وہ اپنی آسایش کو مقدم سمجھتا ہے۔ اِس تکیہ کے مکانات نصف سے زیادہ گر چکے ہیں اور باقی

سر بسجود ہونے کو ہیں۔ اُن کی مرمت کا کچھ انتظام نہیں۔ البتہ شیخ نے اپنا نج کا مکان جو اِسی تکیہ کے قریب ہے خوب بنا رکھا ہے۔ اسمیں کچھ قصور ہندوستانیوں کا بھی ہے کہ وہ بھیک مانگتے ہوئے یہاں پہنچتے ہیں۔ اور شیخ کی نظروں میں اُن کی کچھ وقعت نہیں ہوتی +

اِس اجمالی کیفیت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ارباب طریقت کے تکیوں کے کچھ حالات بھی قلم بند کروں۔ اصحاب طریقت میں سے مولویوں کا ایک فرقہ ہے جو مثنوی شریف کے مصنف مولانا جلال الدین صاحب مرحوم رومی کی طرف منسوب ہے۔ مولانا دراصل بلخ کے رہنے والے تھے۔ مگر ان کی عمر کا بڑا حصہ ملک روم میں گزرا اور آخر کار یہیں ۶۷۲ھ میں انتقال فرمایا۔ آپکا مقبرہ شہر قونیہ میں ہے۔ فرقہ مولویہ کی خاص علامت کلاہ نمد ہے۔ جو ترکی ٹوپیوں کی طرح گول اور دو بالشت کے قریب لمبی ہوتی ہے۔ یہ لباس انہیں ہر مجمع میں بڑی آسانی کے ساتھ اوروں سے متمیز کرا دیتا ہے۔ مولویوں کے پانچ تکیے قسطنطنیہ میں ہیں جن میں اس فرقہ کے سینکڑوں بچے بوڑھے رہتے ہیں اور مولوی کے لفظ سے پکارے جاتے ہیں۔ اِن کو کھانا کپڑا اور کچھ جیب خرچ بھی ملتا ہے۔ تین برس کی خدمت کے بعد سند مل جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ لیکن سند کے بغیر کسی کا مولوی ہونا تسلیم نہیں کیا جاتا +

استنبول کے جس قدر تکئے ارباب طریقت سے مختص ہیں اُن میں ہر ہفتہ ایک دفعہ مجلس ذکر منعقد ہوتی ہے جن میں علاوہ ارباب طریقت کے عامۂ شائقین

بھی بغرض سیر شریک ہوتے ہیں۔ تکیہ رفاعیہ واقعہ اُسکدار اور تکیہ مولویہ واقعہ بیوغلی کی مجالس بالخصوص دیکھنے کے لایق ہیں۔ انگلستان۔ فرانس۔ جرمنی۔ روس امریکہ وغیرہ کے جتنے سیاح یہاں آتے ہیں ان مجلسوں کا تماشا دیکھے بغیر اپنی سیر کو مکمل نہیں سمجھتے۔ ہر ایک تکیہ میں مجلس ذکر کے لئے جدا جدا دن مقرر ہے +

تکیہ رفاعیہ کی مجلس کے واسطے جمعرات کا دن مقرر ہے۔ میں وقت مقررہ پر شیخ ولی محمد صاحب افغان شیخ التکیہ قادریہ بیکلربیگ کے ہمراہ جو بڑے مسافر دوست اور باہمت شخص ہیں تکیہ اسکدار میں گیا۔ ہمارے پہنچنے سے پیشتر چار پانچ یورپین وہاں موجود تھے اور کچھ یکے بعد دیگرے آکر بیٹھتے جاتے تھے۔ شروع مجلس کے وقت اِن کی تعداد بیس تھی مگر ایک گھنٹہ کے اندر چالیس تک نوبت پہنچ گئی۔ جن میں تیس ۳۰ جنٹلمین اور دس ۱۰ لیڈیاں تھیں۔ ان کے واسطے مسجد کے ایک طرف بنچین بچھی ہوئی تھیں۔ ہر سیاح سے ۵ قرش (۱۰) فیس داخلہ لی جاتی۔ اور قہوہ کی ایک پیالی سے ان کی تواضع کی جاتی ہے۔ مگر مسلمان بلافیس داخل ہوتے ہیں۔ ذکر و شغل کے علاوہ ایک خاص امر جو حاضرین کی دلچسپی کا باعث اس وقت ظہور میں آیا وہ یہ ہے کہ ارباب تکیہ برہنہ پا تلواروں کی دھار پر سے گذرتے رہے اور ان کے پاؤں کو تلوار کی دھار سے آنچ تک نہ آئی +

صفوت پاشا کے تکیہ قادریہ واقع استنبول میں جمعہ کے دن ذکر کی مجلس منعقد ہوتی ہے۔ میں اور قیصریہ کا ایک مسلمان سیاح دو نوبل کر یہاں گئے۔ اِس تکیہ میں یورپین سیاح کوئی نہیں تھا۔ دو گھنٹے کے قریب ذکر ہوتا رہا۔ اثناء ذکر

میں مجلس کی ہیئت میں ایک نہ ایک تبدیلی واقع ہوتی تھی۔ مثلاً پہلے بیٹھکر ذکر کیا گیا پھر ایک دائرہ کی شکل میں سب کھڑے ہوکر ذکر کرتے رہے۔ پھر ایک دائرہ کے دو دائرے ایک دوسرے کے اندر بنا کر ذکر شروع کیا۔ دائرہ میں کھڑے ہوتے وقت ان کی ایک بانہہ ایک کے کندھے پر اور دوسری بانہہ دوسرے کی کمر میں تھی۔ اور اس طرح وہ سب کے سب ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہوکر دائرہ کی شکل میں گردش کرتے جاتے تھے۔ کبھی کوئی آدمی دایرہ میں سے نکلکر چلا جاتا تھا۔ اور کبھی کوئی نیا آدمی آکر شامل ہوجاتا تھا۔ یہ لوگ ایسے مشاق ہیں کہ کسی کے آنے جانے سے ان کے دائرہ اور گردش میں کچھ بدنظمی نہیں ہوتی تھی۔ شیخ التکیہ ابتداءً سب کے ساتھ گردش کرتا اور پھر دائرہ سے نکلکر دائرہ کی ترتیب اور اس کے انتظام کو دیکھتا بھالتا۔ اور کبھی کبھی دائرہ کے مرکز میں داخل ہوکر زبان اور ہاتھ سے طریق ذکر کی رہنمائی کرتا تھا۔ کبھی اِدھر اُدھر کے کمروں میں بھی کسی کام کے واسطے چلا جاتا تھا اور مرید اُسی طرح اپنے شغل میں لگے رہتے تھے۔ طریقہ ذکر میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے مثلاً پہلے نفی و اثبات کا ذکر زبان سے کیا جاتا ہے۔ اور پھر خاص حرکات کے ذریعہ آواز لاالہ الااللہ دل سے نکالی جاتی ہے۔ اور خاتمہ پر دعائیں پڑھی جاتی ہیں ◆

مجھے آستانہ کے نامور شیخ الطریقت شیخ ابوالہدےٰ آفندی رفاعی خالدی صیادی کے تکیہ رفاعیہ میں دو مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا۔ شیخ ابوالہدےٰ جس قدر کہ علم اور فضل میں باکمال ہیں۔ اسی قدر اِن کی مجلس ذکر ان تمام تکلفات سے مبرا ہے۔ علاوہ بریں ان کی مجلس میں روم۔ شام۔ عراق۔ حجاز۔ وغیرہ کے علمائ

اور ارباب طریقت حاضر ہوتے ہیں۔ اور ان کے رسوخ سے اپنے مطالب حاصل کرتے ہیں ❖

شیخ ابوالهدیٰ کو ارکان سلطنت میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور شاید ایک ہزار پونڈ ماہوار تنخواہ ملتی ہے۔ سیاسی معاملات میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ اور اسی وجہ سے سلطنت کے تمام وزراء ان کا لحاظ کرتے ہیں ❖

عشرۂ محرم

مجالس عزا کی جو کیفیت یہاں دیکھنے میں آئی وہ بمقابلہ ہمارے ملک کے بالکل حیرت انگیز ہے۔ ترک تو بیشتر سنّی ہیں۔ مگر ایرانی لوگ جن کی تعداد کئی ہزار سے کم نہیں سال بسال عزاداری کی مجلسیں بڑے جوش وخروش سے برپا کرتے ہیں۔ ان مجالس کا صدر مقام خان والدہ اور خان یلدوز ہے جو استنبول میں ایرانیوں کے رہنے کی کاروان سرائیں ہیں۔ مجھے اپنے مصری دوست محمد حسین تبریزی کے ذریعہ ان مجالس میں جانے کا اتفاق ہوا۔ مجلس عزا شیشہ و آلات۔ جھاڑ اور فانوس سے خوب آراستہ تھی۔ روضہ خوان ممبر پہ بیٹھکر مصائب کربلا نثر میں بیان کرتا تھا۔ پھر ایک دستہ ماتم کرنے والوں کا ایک خان سے دوسری خان میں آتا بعض لوگ اشعار پڑھتے ہوئے بہت زور سے سینہ کوبی کرتے اور بعض زنجیروں سے پشت لال کرتے تھے۔ ان کے بعد بچّوں کا ایک دستہ آتا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں موم کی بتّی فانوس میں لگی ہوئی ہوتی تھی۔ دو تین لڑکے اشعار پڑھتے اور باقی آہستہ آہستہ اپنی چھاتی پہ ہاتھ لگاتے تھے۔ ترک نہایت خاموشی سے ان مجالس میں

شامل ہوتے اور مصائب کربلا سنتے تھے۔ خاتمہ پر ہر شب اول خلیفۃ المسلمین کی درازئی عمر کی دعا مانگی جاتی۔ پھر شاہ ایران کی ترقی اقبال کی دعا ہوتی۔ پھر سفیر ایران کی اور پھر یزید و ابن زیاد پر لعنت کی جاتی۔ اور حاضرین بیش باد کہتے تھے ٭

شب عاشورہ کو جو ماتم ہوا وہ بہت غضب کا تھا۔ سر شام ایک دستہ خان یلدوز میں پہنچا۔ سر برہنہ اور بیچ سے منڈا ہوا۔ ماتمی لباس کی جگہ سفید کفنیاں گلے میں۔ لمبی لمبی چھریاں ہاتھ میں تھیں تھوڑی دیر کے بعد یہ دستہ حلقہ باندھے ہوئے خان سے باہر نکلا۔ ایک شخص مصائب کے حالات پڑھتا جاتا تھا اور یہ چھریاں سر پر مارتے جاتے تھے۔ کفنیاں سرخ ہوگئیں اور ایک دو پر کسی قدر بیہوشی کے آثار بھی نمودار ہونے لگے۔ اس ہیئت کے ساتھ یہ دستہ خان والدہ میں پہنچا۔ وہاں اس قسم کے اور دستے بھی موجود تھے۔ اور ذوالجناح ایک کی جگہ تین۔ ان کی زینیں تیروں سے چھدی ہوئیں۔ اُن پر ڈھال تلوار لگی ہوئی۔ زین پوش پر خون کے دھبے ڈالے ہوئے تھے۔ جھاڑ۔ فانوس کے علاوہ بعض تاجروں نے برقی روشنی بھی کر رکھی تھی۔ اس دستے کے ساتھ ٹرکی پولیس کا انتظام بہت تسلی بخش تھا تمام راستوں کی ناکہ بندی ہو رہی تھی ٭

دسویں تاریخ کی صبح ایرانی لوگ کربلا میں گئے جو اُسکدار کی آبادی کے ایک طرف ہے۔ دس دس بارہ بارہ آدمی اپنا اپنا فرش بچھا کر الگ بیٹھے ہوئے تھے اور دعائیں پڑھ رہے تھے۔ چاہ کے سماوار گرم تھے۔ جو آتا اُس کی تواضع کرتے تھے ٭

سیر گاہیں

قسطنطنیہ اور اُس کے گرد و نواح میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ مقام قدرت کی دلچسپیوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں ایسی ایسی پر فضا سیر گاہیں اور پر لطف قدرتی مناظر موجود ہیں۔ جن کی سیر سے طبیعت نہایت محظوظ ہوتی ہے۔ یہاں کے باشندوں میں اس قسم کی سیر گاہوں سے لطف حاصل کرنے کا عام مذاق ہے۔ اور اُنہوں نے مختلف سیر گاہوں کے لئے جدا جدا دن مقرر کر رکھے ہیں جن میں مسلمان عیسائی اور یہودی گروہ کے گروہ چلے آتے ہیں +

مجھے اپنے زمانہ اقامت میں بیشتر اُن سیر گاہوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا جو باسفورس کے کنارہ پر واقع ہیں۔ اسواسطے میں عنوان بالا کے تحت میں صرف باسفورس اور اُس کی آبادیوں کے بیان پر اکتفا کروں گا +

باسفورس یہ آبنائے بحیرہ اسود اور بحیرہ مارمورا کے درمیان واقع ہے ترک اس کو بُغازہ کہتے ہیں۔ بغازہ نے اس شہر اور اس کے نواح میں کچھ ایسی رونق اور دل فریبی پیدا کر دی ہے جسکی نظیر دنیا میں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی قسطنطنیہ کی جو حفاظت بحیرہ مارمورا کی طرف سے ڈارڈینلز کے ذریعہ ہوتی ہے وہی حفاظت بحیرہ اسود کی طرف سے بغازہ کے ذریعہ متصوّر ہے۔ اس کے کناروں پہ جابجا قلعے بنے ہوئے ہیں جن کا استحکام آبنائے ڈارڈینلز کی مانند ہے بُغاز کا طول قریباً سترہ میل اور عرض ۸۰۰ گز سے لیکر ڈیڑھ میل تک ہے۔ اور وسط میں پانی کا عمق ۱۲۰ گز تک +

بُغاز کی سیر کا لطف چھوٹے چھوٹے سٹیمروں کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اِن سٹیمروں کا ہیڈ کوارٹر اُس پل کے پاس ہے جو گولڈن ہارن کے شمالی حصہ پر بنا ہوا ہے اور غلطہ کا پل کہلاتا ہے۔ ہر آدھ گھنٹہ کے بعد ایک سٹیمر یہاں سے چلتا ہے اور بُغاز کی مسافت طے کر کے وقت مقررہ میں واپس آجاتا ہے۔ صبح سے شام تک سٹیمروں کی آمد و رفت کا یہی حال ہے کہ ایک آیا اور ایک گیا۔ تقسیم ٹکٹ کے واسطے دفتر مقرر ہے۔ اور اوقات روانگی کے چھپے ہوئے ٹائم ٹیبل دفتر کے باہر چسپان ہیں۔ ہزاروں کاروباری لوگ۔ ملازمان دفتر اور تاجر جو ہر روز صبح استنبول آتے اور شام کو اپنے دیہات میں واپس چلے جاتے ہیں ٹکٹ لے لیکر سٹیمر پر سوار ہوتے جاتے ہیں اور سٹیمر اوقات مقررہ پر چل دیتا ہے۔ اگر سٹیمر کے آنے میں کچھ دیر ہو تو مسافر ویٹنگ روم میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور اگر زیادہ دیر ہو تو قہوہ خانہ میں جاکر دل بہلاتا ہے دفتر کے قریب چوبی مکانات کا ایک بازار بنا ہوا ہے۔ اس میں ہر قسم کی خرید و فروخت ہوتی رہتی ہے +

سٹیمروں کے سفر کا یہ حال ہے کہ بعض تو بُغاز کے صرف دائیں سمت کے مسافروں کو اور بعض صرف بائیں سمت کے مسافروں کو چڑھاتے اُتارتے چلے جاتے ہیں۔ اور بعض دونوں سمتوں کے اسٹیشنوں پر چکر لگاتے ہوئے مسافروں کو لاتے اور لیجاتے ہیں۔ بُغاز کی آبادیوں میں سے اسکدار۔ بیکلربیک توپخانہ۔ بشکتاش۔ دُلمہ باغچہ۔ محلات شاہی۔ اور قاضی کوئی زیادہ مشہور ہیں قصر حیا غان کی عمارتیں خصوصیت سے قابل دید ہیں جو نصف میل تک سمندر

کے کنارہ کنارہ پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اور جن کی سنگ مرمر کی نفاست اور اس پر گلکاریوں کی لطافت دیکھکر انسان متحیر ہو جاتا ہے۔ اس قصر کے پیچھے کی پہاڑی پر ایک محل ہے جس میں سلطان المعظم کے ولیعہد رشاد آفندی قیام پذیر ہیں +

بُغاز کی تمام آبادیوں کی ہوا نہایت صحت بخش اور نظارہ پر فضا ہے۔ اکثر امراء کے مکانات عین بغاز کے کنارہ پر واقع ہیں۔ مکانوں کے ارد گرد بعض جگہ باغچہ اور سبزہ زار بھی ہیں اور امرا موسم گرما میں ان مکانوں میں قیام کرتے ہیں۔ متوسط درجہ کے لوگ بوقت فرصت تبدیل ہوا کی غرض سے آتے رہتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ تو غریب سے غریب آدمی بھی ان آبادیوں کی سیر کو چلا آتا ہے۔ جمعہ اور اتوار کا دن اس سیر کیواسطے مخصوص ہے۔ زیادہ ہجوم اتوار کو ہوتا ہے۔ مسلمان نصرانی یہودی زن و مرد بکثرت ان موقعوں پر شریک ہوتے ہیں۔ ناواقف آدمی کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا میلہ لگ رہا ہے۔ بعض آدمی صرف تبدیل ہوا کی غرض سے جاتے ہیں اور بعض مہ جبینوں کے نظارہ کی خاطر۔ قہوہ خانہ کے باغوں میں کرسیاں بچھی رہتی ہیں۔ جہاں جسکا جی چاہے بیٹھ جائے۔ امیر و غریب۔ مسلمان اور غیر مذہب کی کوئی تفریق اس نشست میں نہیں ہوتی۔ انواع و اقسام کی مخلوقات۔ سمندر کی فرحت بخش ہوا۔ قوالان خوش الحان کی دلکش آوازیں۔ نغمہ ہائے طنبوری کی دلچسپ صدائیں۔ کھانے پینے کے سامان۔ دوستوں کی ملاقات۔ غرض ایسے اسباب فراہم ہوتے ہیں جس سے غمگین اپنا غم والم بھول جاتا ہے۔ بیمار تندرستی پاتا ہے۔ اور تندرست کو جو لطف حاصل ہوتا ہے وہ اس کے لئے گویا جیتے جی بہشت کا ایک نظارہ ہے +

ترکوں کا تمدن

ترکوں کے طرز تمدن میں جو تغیر اور تبدیلیاں سو برس کے اندر اندر واقع ہوئی ہیں بہت حیرت انگیز معلوم ہوتی ہیں۔ اگر تاریخی نگاہ سے دیکھا جائے کہ یہ اور ان کے تاتاری النسل بھائی اہالی ایران دونوں وسط ایشیا کے رہنے والے ہیں تو جو فرق ان کے باہمی تمدن میں پایا جاتا ہے وہ اس حیرت کو اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ ایران کی تاتاری نسلیں باوجود زمانہ کی روز افزوں ترقیات کے اُسی پرانی وضع پر قایم ہیں۔ مگر استنبول کے تاتاری النسل موجودہ ترقیات سے پورا فایدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور آج مہذب قوموں میں شمار ہوتے ہیں +

اخلاق و عادات

ترک انتہا درجہ کے بامروت بااخلاق اور مسافر نواز ہیں۔ وہ غیر قوموں سے برادرانہ اور مساوات کا برتاؤ کرتے ہیں۔ غرور۔ نخوت اور خود بینی گویا ایسے الفاظ ہیں جن کے عملی مفہوم سے وہ آشنا تک نہیں۔ متعصب عیسائی دور بیٹھے بیٹھے خواہ ترکوں پر کتنا ہی اتہام کیوں نہ لگائیں مگر یہ ممکن نہیں کہ ایک سلیم الطبع عیسائی استنبول میں جائے اور ترکوں سے ملنے کے بعد اپنے عیسائی بھائیوں کے غلط خیالات کی تردید نہ کرے +

مجھے اپنے ایام اقامت میں ترکوں سے جس قدر زیادہ برتاؤ کا موقعہ ملا اُسی قدر اُن کی خوش خلقی اور مسافر نوازی کے نمونے میری مسرت کا باعث ہوتے گئے

ابتداءً اجنبیت کے باعث جب کبھی میں راہ بھول جاتا تو جس ترک سے پوچھتا وہ نہایت تپاک سے مجھے راستہ بتاتا - اور کبھی کبھی منزل مقصود تک پہنچا آتا - دو تین مرتبہ نقل مکان کرنے میں قلیوں نے اُجرت کا جھگڑا کیا تھا - مگر جو ترک اس موقعہ پر تھے انہوں نے قلیوں کو فہمائش کی اور زیادہ اجرت لینے سے روک دیا - حالانکہ جب مصر میں قلیوں اور گدھے والوں کی طرف سے تکرار ہوتی تو مصری ہمیشہ مسافر کے برخلاف قلی کی حمایت کرتے - اور اس کو زیادہ اُجرت دلاتے تھے ⁂

متوسط درجہ کے لوگوں کے اخلاق اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ جب کوئی ملاقاتی ان کے مکان پہ جائے اور کھانے کا وقت ہو تو ممکن نہیں کہ اس کو کھانا کھلائے بغیر رخصت کریں - بلکہ شب کو جب کبھی باتیں کرتے کرتے دیر ہو جائے تو کھانے کے علاوہ ملاقاتی کی شب باشی کا انتظام بھی کرتے ہیں - امرا کی فیاضی تو اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسافروں کو مہینوں اپنے ہاں مہمان رکھتے ہیں - اس عرصہ میں ان کی خوراک پوشاک اور جملہ ضروری مصارف کے ہر طرح متکفل ہوتے ہیں - روانگی کے وقت منزل مقصود تک کا زاد راہ بھی دیتے ہیں ⁂

مکانات ترکوں کے مکانات یورپ و ایشیا کے ایک مخلوط نمونہ پر بنے ہوئے ہیں - ان مکانوں میں بیٹھنے - مطالعہ کرنے - کھانے پینے - اور سونے کے کمرے علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں - فرش بہت عمدہ اور قالینوں سے آراستہ ہوتا ہے - متوسط درجہ اور بالخصوص امرا کی نشست کے کمروں

اور کرسیوں پر ہے۔ مگر مصریوں کے خلاف بوٹ پہنے ہوئے فرش پہ جانا ان کے ہاں معیوب ہے۔ باہر کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے۔ اور کھٹکے کے ذریعہ کھولا جاتا ہے۔ اس کھٹکے کا ذکر مصر کے مکانوں میں ہو چکا ہے +

یہاں کے مکانوں میں ایک نئی بات یہ ہے کہ باوجود دو منزلہ سہ منزلہ ہونے کے لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔ اور ان میں اکثر آگ لگتی رہتی ہے۔ ٹرکی گورنمنٹ کی طرف سے آگ بجھانے کا بڑا انتظام ہے۔ ایک بلند جگہ پر اسی غرض سے منارہ بنا رکھا ہے۔ جہاں سپاہی ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ جب کبھی آگ کے شعلے بھڑکتے دکھائی دیں۔ تو سپاہی منارہ سے ایک فانوس آویزاں کر دیتا ہے۔ تاکہ آگ بجھانے والے عملہ کو خبر ہو جائے۔ کئی دفعہ اس منارے پر تین تین فانوس یک لخت آویزاں ہوتے ہیں۔ فانوس دیکھکر آگ بجھانے والے بڑی تیزی سے پمپ لیکر جاتے اور آگ بجھا دیتے ہیں +

کھانے کا طریقہ

ترکوں میں کھانا کھانے کا وہی طرز ہے جو مصریوں کا ہے۔ عام طور پر ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھائی جاتی ہیں۔ مختلف قسم کے کھانے ایک ایک قاب میں رکھے جاتے ہیں اور سب لوگ ہاتھ ڈال ڈال کر اس میں سے کھاتے ہیں گھٹنوں پر ایک رومال بھی ہوتا ہے کہ کھانے کا چھینٹا کپڑوں پر نہ پڑے۔ امرا علے العموم انگریزی فیشن کے مطابق کھانا کھاتے ہیں۔ جس میں ہر ایک شخص کے آگے علیحدہ علیحدہ رکابی رکھی جاتی ہے۔ چھری کانٹے اور چمچے کا استعمال بھی جاری ہے +

مشائخ اور علما کے کھانے کا طریق ان لوگوں سے فی الجملہ مختلف

ہے۔ اُن کے ہاں فرش پر روئی دار گدیلے بچھے ہوتے ہیں۔ اور لکڑی کا ایک خوان ایک فٹ اونچا بچھا کر اسپر کھانا رکھتے ہیں۔ اور سب ملکر کھاتے ہیں چمچے بھی ہوتے ہیں مگر لکڑی کے +

مردانہ لباس

ترکوں کا لباس بالکل اہل یوروپ کی مانند ہے۔ اگر پُھندنے دار سُرخ کی ٹوپی اُن کے سروں پر نہو تو کیا بلحاظ شکل وصورت اور کیا بلحاظ لباس بالکل یوروپین معلوم ہوں۔ ان کی پتلون ذرہ ڈھیلی اور کوٹ کسی قدر لمبا ہوتا ہے۔ اور گلا کشادہ۔ ہمارے ہاں ہندوستان میں ایک لمبا فراک کوٹ گلا بند جو ترکی کوٹ کہلاتا ہے۔ یہ ہندوستانیوں کی ایجاد اور غالباً حیدر آباد دکن کی نقل ہے +

مشائخ اور علما ربدستور جبے پہنتے اور ٹوپی پر لقہ باندھتے ہیں جبہ کے نیچے ایک صدری اور ایک پاجامہ بٹن دار ہوتا ہے جو اوپر سے بہت کشادہ اور گھیر میں چُنٹیں پڑی ہوتی ہیں +

ترکوں کا بوٹ البتہ خاص وضع کا ہوتا ہے جو مینے اب تک کہیں نہیں دیکھا۔ ٹخنوں تک ہلکے چمڑے۔ اور سبک تلے کا ایک موضع نما بوٹ ہوتا ہے جس پر ایک گرگابی پہنتے ہیں۔ اور یہ دونوں ملکر بالکل ایک خوبصورت بوٹ کی شکل بن جاتے ہیں۔ اور ایک کمانی کے ذریعہ اس گور گابی کو بآسانی پہن اور اُتار سکتے ہیں +

گھر سے باہر پھرنے چلنے میں یہ موزہ اور گور گابی دونوں پاؤں میں ہوتے ہیں۔ لیکن جب مسجد۔ سرکاری دفتر۔ اور گھر کے اندر جائیں تو گورگابی

پانوں سے نکال دیتے ہیں۔ اور موزہ نما بوٹ پاؤں میں باقی رہتا ہے۔ بوٹ کا حصہ بالکل صفا ہوتا ہے۔ ترک اس کو پہنے ہوئے نماز پڑھتے ہیں۔ اور کھانا بھی کھاتے ہیں۔ استنبول میں اس کو کندرہ کہتے ہیں۔ اس کی قیمت پانچ سے لیکر پندرہ روپے تک ہے +

زنانہ لباس مردوں کی طرح یہاں کی عورتوں کے لباس میں بھی بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ وہ گھروں میں علے العموم یوروپین لباس پہنتی ہیں۔ مگر جب اُن کو کہیں باہر جانا ہو تو ایک ڈھیلا ڈھالا اور لمبا سا گون کپڑوں کے اوپر اوڑھ لیتی ہیں جو گردن سے پاؤں تک اُن کے بدن کو ڈھانپ لیتا ہے۔ سر پہ قصابہ اور چہرہ پہ ایک باریک رومال نقاب کا کام دیتا ہے۔ آنکھیں البتہ کھلی ہوتی ہیں +

پردہ ترکی عورتیں شرعی پردہ کی پابند ہیں۔ مگر بازاروں میں جاتی اور گھر کا سودا سلف خرید لاتی ہیں۔ بلکہ سیرگاہوں میں بھی بے تکلف جاتی ہیں۔ پہلے یہ حال تھا کہ عورتیں بازاروں اور گلیوں میں چلتے پھرتے لوگوں سے بات چیت کر لیتی تھیں۔ مگر سلطان المعظم نے اِس آزادی کو ناواجب سمجھکر یہ حکم جاری کر دیا کہ کوئی عورت بازار یا گلی کوچہ میں چلتے پھرتے کسی شخص سے بات چیت نہ کرے اگرچہ خاوند ہی کیوں نہ ہو۔ اگر اس کے برخلاف کوئی مرد کسی عورت سے یا عورت کسی مرد سے بات چیت کرے تو ترکی پولیس کا فرض ہے کہ ان کو تھانے میں لے جائے۔ اس سے بیجا آزادی میں بہت کچھ روک تھام اور بُرائی کا احتمال کم ہو گیا ہے۔ یہ حکم اس سختی سے

نافذ ہے کہ ایک دفعہ میں ایک ایرانی دوست کے ساتھ سٹیمر میں سوار بُغاز کی سیر کو جا رہا تھا۔ سٹیمر میں ایک عورت اور ایرانی کی چار آنکھیں ہوئیں مگر عورت نے مسکرا کر مُنہ پھیر لیا۔ مینے ایرانی سے پوچھا کہ یہ کون ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ ایک نصرانی عورت ہے اور سارا قصہ بیان کرنے کے بعد یہ کہا کہ سلطانی حکم کے موافق کوئی مرد کسی عورت سے بات چیت نہیں کر سکتا۔ اگر میں اس سے اس وقت بات چیت کروں۔ اور پولیس مین دیکھ لے تو پھر ہم دونوں کو تھانہ کی ہواخوری کرنی پڑیگی۔ ان حالات سے میرے ہندوستانی ہم وطن اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلاد اسلامیہ اور ہندوستان میں عورتوں کے بازاروں میں چلنے پھرنے کا کس قدر تفاوت ہے +

تعلیم نسواں ترکی عورتوں نے لباس اور آزادی میں جس قدر ترقی کی ہے اس کے ساتھ علمی قابلیت میں بھی نمایاں کامیابی کا فخر حاصل کیا ہے۔ وہ ترکی زبان میں اچھی طرح لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ امرا کی عورتیں تو فرانسیسی بھی جانتی ہیں بعض عورتوں نے لکھنے پڑھنے میں اس قدر ترقی کی ہے کہ اخباروں میں مضامین لکھتی اور کتابیں تصنیف کرتی ہیں۔ بعض عورتوں کی قابلیت اس درجہ پر پہنچ گئی ہے کہ اپنے خاوندوں کے کاروبار کا انصرام اور ان کی جائداد کا انتظام بڑی دانشمندی اور سلیقہ سے کرتی ہیں۔ اور ان کے خاوند خانگی انتظامات سے بےفکر ہو کر سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ تعلیم نسواں کے واسطے ترکی گورنمنٹ کی طرف ایسے اچھے اصول پر مکتب جاری ہیں۔ کہ شرفا کو اپنی لڑکیاں وہاں بھیجنے میں ذرہ تامل نہیں ہوتا۔ ان مکتبوں میں ترکی

فرانسیسی - حساب اور جغرافیہ کی تعلیم ہوتی ہے - بعض مکتبوں میں موسیقی اور تصویر کشی کا کام بھی سکھایا جاتا ہے - ان مکتبوں میں جو لڑکیاں جاتی ہیں انہیں دس برس کی عمر تک چہرہ پہ نقاب ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی - وہ اس عرصہ میں اپنے باپوں کے ساتھ باغوں کی سیر کو بھی جاتی ہیں - اور گھر سے مدرسہ تک بے کھٹکے آمد و رفت کرتی ہیں - امرا کی لڑکیوں کے ساتھ مدرسہ کی آمد و رفت کے وقت ایک حبشی غلام بھی ہوتا ہے ؞

اکثر امرا کے ہاں بچوں کی تربیت کیواسطے فرانسیسی نرسیں دائیں نوکر ہیں جن کے ذریعہ فرانسیسی زبان اور یوروپین قوموں کے رسم و رواج بغیر کتابی تعلیم کے انہیں آجاتے ہیں - غالباً انہی نرسوں کا وجود ترکی مستورات میں یوروپین لباس کی ترغیب کا باعث ہوا ہے یہ تہذیب اگرچہ دن بدن ترکی گھرانوں میں بڑھتی جاتی ہے مگر اس کے ساتھ انتظام خانہ داری اور بچوں کی پرورش میں جو دلی رغبت ترکی مستورات کو ہے وہ بہت ہی تحسین و آفرین کے لائق ہے - میرے معلومات کے مطابق ترکی مستورات علمی قابلیت اور انتظام خانہ داری میں مصری عورتوں سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہیں ؞

قہوہ خانے

ترکوں سے میل ملاقات پیدا کرنے - اُن کے عادات و اوضاع سے شناسا ہونے - اور استنبول کے حالات جاننے کا سب سے عمدہ ذریعہ قہوہ خانے ہیں جن میں صبح و شام ہر قسم کے لوگ موجود رہتے ہیں - امرا غربا اہل علم اور تجارت پیشہ غرض کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا کہ فرصت کے وقت گھنٹہ آدھ گھنٹہ یہاں نہ آتا ہو مگر ان قہوہ خانوں کے مختلف مراتب ہیں کم بضاعت

ادنے درجے کے قہوہ خانوں اور ذی استطاعت اعلےٰ درجے کے قہوہ خانوں میں آمدورفت رکھتے ہیں +

یہ قہوہ خانے یوں تو شہر کے تمام حصوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں مگر سب سے زیادہ پرلطف اور صحت بخش وہ قہوہ خانے ہیں جو بغاز کے کنارہ واقع ہیں۔ چائے۔ قہوہ اور حقہ پینے کو۔ اخبارات مطالعہ کو۔ شطرنج اور بلیرڈ کھیلنے کو موجود ہیں۔ نشست کے واسطے عمدہ قسم کی کرسیاں۔ اور چانوشی کے واسطے بہت نفیس میزیں مہیا ہوتی ہیں۔ ترک اپنے احباب کی تواضع ان چیزوں سے کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ اسی تواضع کے سلسلہ میں مسافر بھی ان سے شناسا ہو جاتا ہے اور ان صحبتوں کے ضمن میں ہر قسم کی علمی اخلاقی۔ تاریخی اور سیاسی گفتگو کا موقعہ اُسے ملتا رہتا ہے۔ مگر سیاسی گفتگو کچھ بہت بچ بچاکر ہوتی ہے۔ مصر کی طرح آزادی نہیں +

یہاں کے قہوہ خانوں میں بعض ایسی قیود بھی رکھی گئی ہیں۔ جن سے اسلامی شوکت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً شام کے بعد جب تک عشا کی نماز نہ ہو جائے کسی کو شطرنج اور بلیرڈ کھیلنے کی اجازت نہیں۔ اسی طرح شب معراج اور دیگر متبرک راتوں میں تمام رات کے لئے یہ کھیل بند رہتے ہیں۔ قہوہ خانے کے منتظم اس امر کے ذمہ وار ہیں کہ قواعد بالا کے خلاف نہ ہو۔ بصورت خلاف ورزی منتظم سے مواخذہ ہوتا ہے۔ مگر مصر میں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں +

تعلیم

زمانہ کی رفتار سے جو تغیر ترکوں کے حالات میں ہوا ہے۔ اگرچہ اُس کا نمایاں اثر اُن کے تعلیمی انقلاب کو ظاہر کر رہا ہے جس کو تعلیم جدید کے نام سے موسوم کرنا زیادہ موزون ہے۔ مگر تعلیم قدیم جو خاصکر مذہبی رنگ میں جلوہ دکھارہی ہے باوجود زمانہ کی اس قدر ترقی کے پھر بھی رو بتنزل ہے +

تعلیم قدیم

یہ تعلیم آغاز سلطنت کیساتھ شروع ہوئی اور چھ سو برس سے مدرسوں اور مسجدوں میں پرانی طرز پر اب تک جاری ہے اس کے طرز میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں آیا کہ پہلے اس کا نصاب اعلےٰ پیمانہ پر تھا۔ اور زمانہ حال میں ادنےٰ پیمانہ پر آگیا ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ابتری کی حالت میں ہے۔ طالبعلموں کی تعداد بہت ترقی پر اور مشرقی اسلامی سلطنتوں کے زوال پانے سے ترکستان اور خراسان تک کے طالبعلم تحصیل علوم دینی کی غرض سے یہاں چلے آتے ہیں۔ جن کی تعداد ہزاروں سے کسی طرح کم نہیں +

اِن طالبعلموں کے کھانے پینے کا انتظام زیادہ تر اوقاف کی آمدنی سے ہوتا ہے۔ اور جو کمی رہ جاتی ہے اس کو یہ لوگ رمضان المبارک کے مہینہ میں جو ان کی تعطیل کا زمانہ ہوتا ہے قسطنطنیہ سے باہر جاکر دیہات سے زکوٰۃ وخیرات وصول کرکے پورا کرتے ہیں۔ اور اس طرح سے سال بھر کے لئے معاش کی جانب سے بے فکر ہوجاتے ہیں۔ ان کے قیام کیواسطے

جو مکانات موجود ہیں وہ علی العموم کہنہ اور تنگ و تاریک ہیں۔ اور ایک ایک کمرہ میں متعدد طالبعلم مل جل کر کسی قدر تکلیف سے گزارہ کرتے ہیں +

تعلیم اکثر مسجدوں میں ہوتی ہے۔ جو درس گاہیں مساجد سے علیحدہ بنائی گئی ہیں اُن کی عمارت زمانہ کی دستبرد سے افسوسناک حالت میں ہے۔ ترک سلاطین نے اپنے اپنے عہد میں جو عمدہ مدرسے بنائے تھے ان میں سے سلطان ابوالفتح محمد خاں ثانی کا مدرسہ اب تک اپنے بانی کے دینی جوش اور اولوالعزمی کی گواہی دے رہا ہے۔ اور غالباً استنبول کے موجودہ مدرسوں سے وسعت میں بڑھا ہوا ہے +

جماعت بندی اور سبق پڑھانے کا جو طریقہ جامع ازہر میں تھا وہی اس جگہ بھی ہے۔ مگر ازہر کے مقابلہ میں یہ نقص زاید ہے کہ استاد سبق پڑھاتے ہوئے عبارت کی تشریح اور سوال وجواب سب ترکی میں کرتے ہیں جس سے طالبعلموں کی عربیت خام رہ جاتی ہے۔ تعلیمی حالت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ کہ علم ادب اور اصول معانی پر چنداں توجہ نہیں کی جاتی۔ تاریخ وجغرافیہ کا تو کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ معقولات کی پڑھائی بہت معمولی طریق سے ہوتی ہے۔ بڑا زور فقہ اور کچھ حدیث کی تعلیم پر ہے جو قضا اور افتا کے عہدہ کا شوق طالبعلموں کی طبیعت کو ان کے حصول پر مائل کر رہا ہے۔ بہرکیف یہاں کے مدرسوں کو جامع ازہر کی تعلیم سے کوئی مناسبت نہیں۔ جامع ازہر جس حالت میں ہے اس کی تعلیم وہاں کے

طلبا کی معاش - اور مکانات سکونت کی کیفیت استنبول کے مدرسوں اور ان طالبعلموں کی زندگی سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے +

ان مدارس کا انتظام شیخ الاسلام کے متعلق ہے جس کا رتبہ سلطنت ٹرکی میں وزیر اعظم سے دوسرے درجہ پر ہے - موجودہ شیخ الاسلام بہت قابل اور صاحب فضیلت ہیں - اب تک اِن مدارس کی اصلاح پر ان کا مائل نہ ہونا تعجب میں ڈالتا ہے +

استنبول کے مدرسوں میں ایسے بہت کم لوگ میری نظر سے گزرے جو عربی زبان میں گفتگو کر سکیں - البتہ جامع فاتح کے مدرس خالص آفندی عربی زبان خوب جانتے اور فارسی اور ترکی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں - یہ اصل میں داغستان کے رہنے والے ہیں - میری ان سے متعدد ملاقاتیں مدرسہ اور گھر پر ہوئیں - بہت بااخلاق اور مسافر دوست ہیں +

تعلیم جدید

آج سے ساٹھ برس پیشتر ترکوں کی ساری توجہ ترکی زبان کے لکھنے پڑھنے پر منحصر تھی - مغربی زبانوں کے حاصل کرنے پر انہیں کچھ رغبت نہ تھی کم و بیش ان کی توجہ جو کچھ تھی وہ فرانسیسی زبان کی تحصیل تک محدود تھی جو سلاطین یوروپ سے خط و کتابت کا ذریعہ ہونے سے اُن کے کارآمد ہو سکتی تھی +

سلطان محمود ثانی کے زمانہ (۱۲۲۳ھ / ۱۸۰۸ء سے ۱۲۵۵ھ / ۱۸۳۹ء) میں دفعتہً سلطان وقت کی توجہ یورپ کی جنگی ترقیات پر مایل ہوئی - اور اس نے ٹرکی کی اصلاحات

کا ارادہ کیا - اِس سلطان کی الوالعزمی سے مغربی علوم وفنون نے ٹرکی میں قدم رکھا - اور ترکوں کو مغربی علوم اور مغربی زبانیں سیکھنے کا شوق پیدا ہوا - سب سے پہلے اس سلطان نے ٹرکی فوجوں کو یورپین طوق پر آراستہ کیا اور ۱۸۰۵ء میں فوجی تعلیم کے واسطے مدرسہ حربیہ کھولا جو سلطنت ٹرکی میں تعلیم جدید کا پہلا کالج ہے - اس کے بعد سلطان عبدالمجید خاں نے ۱۸۶۱ء میں جدید تعلیم کو وسعت دینی شروع کی - اِس وقت سے یہ تعلیم روزافزون ترقی پر ہے +

تعلیم عام ترکی میں عام تعلیم کے واسطے اس وقت تین قسم کے مکتب* جاری ہیں :-

(۱) - **مکاتب ابتدائی** - اِن کی مدت تعلیم دو برس اور مضامین داخل درس حسب ذیل ہیں - قرآن شریف - ترکی کا لکھنا پڑھنا - اور حساب کے ابتدائی چار قاعدے +

(۲) **مکاتب رشدی**
(۳) **مکاتب اعدادی**

ان دونوں مدرسوں کی مدت تعلیم تین تین برس ہے - انمیں - ترکی - عربی - فرانسیسی عقاید - حساب - جغرافیہ - اقلیدس - اصول تجارت - اور نقشہ کشی کی تعلیم دی جاتی ہے - عربی اور فرانسیسی کے علاوہ جس قدر مضامین پڑھائے جاتے ہیں - ان سب کی تعلیم ترکی زبان میں ہوتی ہے - مکتب اعدادی تک تعلیم حاصل کرنے سے طالبعلم کو ترکی زبان کے لکھنے پڑھنے اور علوم مروجہ

* - ترکوں نے مدرسہ اور مکتب میں یہ تفریق قایم کی ہے کہ جہاں دینی تعلیم ہو اس کو مدرسہ اور جہاں دنیاوی تعلیم ہو اس کو مکتب کہتے ہیں +

ہیں اس قدر لیاقت ہو جاتی ہے جو ہمارے ہاں انٹرنس کے درجہ کے مساوی ہوتی ہے۔ ملکی تعلقات کے لحاظ سے سرکاری ملازمت حاصل کرنے میں چونکہ فرانسیسی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ اس واسطے یہ زبان لازمی طور سے پڑھائی جاتی ہے۔ اور طالبعلم کو اس میں اچھی مہارت ہو جاتی ہے مگر عربی کی تعلیم بہت مختصر ہوتی ہے ؛

استنبول اور تمام بلاد ترکی میں مکتب رشدی اور اعدادی دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) ملکی (۲) حربی۔ مکتب ابتدائی پاس کرنے کے بعد طالبعلم کا اختیار ہے کہ ملکی مکتب میں داخل ہو یا حربی میں۔

دیگر مکاتب

مدارس اعدادی کی تعلیم ختم کرنے پر طالبعلم کو اختیار ہوتا ہے کہ جس علم یا فن کی طرف اس کا میلان ہو۔ اس کی تحصیل میں کوشش کرے۔ مختلف علوم و فنون کی تعلیم کے واسطے مفصلہ ذیل مکتب ہیں :-

مکتب الطب (میڈیکل سکول)
مکتب الہندسہ (انجینرنگ سکول)
مکتب الحقوق (لا سکول)
مکتب البحری (مدرسہ جہاز رانی)
مکتب الصنائع (آرٹ سکول)
مکتب اللسان (مغربی زبانوں کا مدرسہ)
مکتب النواب (قاضیوں اور مفتیوں کا مدرسہ)
مکتب المعلمین (نارمل سکول)

ان مکتبوں میں تمام وہ علوم پڑھائے جاتے ہیں جو آج کل بلاد یورپ کے نامی مدارس میں داخل درس ہیں۔ عملی تعلیم کے واسطے ہر قسم کا سامان مکتب الہندسہ۔ مکتب الطب۔ مکتب البحری اور مکتب الصنائع میں بڑی

فراخ حوصلگی سے اعلےٰ پیمانہ پر مہیا کیا گیا ہے۔ پروفیسر نہایت عالم اور روشن خیال ہیں۔ زبانوں میں سے ترکی اور فرانسیسی کی تعلیم بہت ترقی پر ہے۔ مکتب بحری میں انگریزی زبان کی تعلیم بھی اہم سمجھی گئی ہے کہ بحری ترقیات کا بڑا مخزن اندلون انگلستان ہے۔ اور یہ مکتب شہر سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پر جزیرہ ہکبری میں ہے۔ عربی اور فارسی زبانیں صرف اس قدر سکھائی جاتی ہیں کہ ان زبانوں کے جو الفاظ ترکی میں مستعمل ہوتے ہیں۔ طلبا اُن کے معنے بخوبی سمجھ سکیں؛

اعلےٰ مکاتب قسطنطنیہ میں تین مکتب اعلےٰ درجہ کے ہیں جنکو کالج کے نام سے ملقب کیا جا سکتا ہے یہ تینوں مکتب ترکوں کی فوجی اور ملکی قابلیت بڑھانے کی غرض سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی مختصر کیفیت یہ ہے +

(۱) مکتب حربی اس میں طالبعلموں کو فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ کالج اپنے بانی سلطان محمود ثانی کے زمانہ میں بہت چھوٹے پیمانہ پر تھا۔ مگر اب مقتضیات زمانہ سے اس کی تعلیم اور انتظام میں بیحد ترقی ہوگئی ہے۔ مدارس اعدادی حربی جو استنبول خاص میں متعدد اور ہر ایک ولایت کے صدر مقام میں ایک ایک ہے اس کالج کا ذخیرہ ہیں جہاں کے طالبعلم فنون جنگ کی تعلیم اور تکمیل کے واسطے یہاں داخل ہوتے ہیں۔ اس کالج میں فنون حربیہ کی علمی اور عملی تعلیم اعلےٰ پیمانہ پر دی جاتی ہے۔ یوروپ کی متعدد زبانوں کے علاوہ طبعیات۔ کیمیا۔ ریاضی اور طب محققانہ اصول پر پڑھائے جاتے ہیں۔ فن حرب کی تاریخ۔ مصوری جرثقیل۔ نجاری۔ آہنگری۔ قلعہ توڑنے۔ سرنگ لگانے۔ محاصرہ کے اصول

فوجوں کی ترتیب - لڑائی کا طریق - یہ جملہ امور ایسے طریق سے سکھائے جاتے ہیں کہ طالبعلم مکتب سے نکلتے ہی فوجی خدمات کے انصرام کے قابل ہو جاتا ہے۔

(۲) مکتب ملکی - یہ مکتب ترکوں کا سول سروس کالج ہے جس میں ملکی خدمات اور نظم ونسق کی تعلیم دی جاتی ہے - یہ کالج سلطان حال کی توجہ سے قایم ہوا ہے اور روزافزوں ترقی پر ہے - اس میں فرانسیسی کے علاوہ یونانی اور ارمنی زبان کی تعلیم لازمی ہے - عربی فارسی بھی داخل درس ہیں - مگر اختیاری طریق پر - تاریخ - جغرافیہ - طبعیات - پولٹیکل اکانمی اصول قانون اور قوانین مروجہ یورپ کی تعلیم بہت اعلےٰ درجہ پر ہوتی ہے - خصوصاً پولٹیکل اندرونی وبیرونی تعلقات کے مسایل بخوبی سمجھائے جاتے ہیں - یہاں کے طالبعلم فارغ التحصیل ہونے پر سول کے اعلےٰ عہدوں پر مامور ہوتے ہیں +

(۳) مکتب سلطانی - یہ کالج بلحاظ قدامت اور تعلیم مضامین کے بہت ممتاز سمجھا گیا ہے - اس میں فرانسیسی زبان التزامی طور سے اور لاطینی - انگریزی یونانی اٹیلین جرمنی اور ارمنی اختیاری طور سے سکھائی جاتی ہیں - طبعیات نیچرل فلاسفی کیمسٹری جیالوجی (طبقات الارض) وغیرہ علوم جدیدہ کی تعلیم بہت ترقی پر ہے - اس مکتب میں مسلمانوں کی نسبت عیسائی زیادہ پڑھتے ہیں +

مکتب العشائر

ان مکاتب کے علاوہ ایک خاص قسم کا مکتب عربی قبائل کی تعلیم کے واسطے سلطان حال نے چند سال سے جاری کیا ہے اس کو مکتب العشائر کہتے ہیں اور بلاد عرب کے تمام بڑے بڑے شہروں سے جہاں یہ قبائل آباد ہیں لڑکے بلا بلا کر داخل کئے گئے ہیں +

مکتب دار الشفقہ یہ مکتب یتیم بچوں کی تعلیم اور تربیت کے لئے قایم ہوا ہے۔اسکی بنیاد سلطان المعظم کی غریب پروری اور علمی دلچسپی کی بےنظیر مثال ہے۔اس مکتب کے تمام مصارف سلطان المعظم اپنی ذاتی آمدنی سے ادا کرتے ہیں۔میرے دوست خالص آفندی اس مکتب میں بھی ایک گھنٹہ پڑھانے جایا کرتے ہیں۔مجھے ان کے ذریعہ اس یتیم خانہ کے دیکھنے اور تفصیلی حالات دریافت کرنے کا اتفاق ہوا۔مکان بڑا عالیشان ہے۔طالبعلموں کی سکونت خوراک اور لباس کو دیکھکر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ متوسط الحال امرار کی اولاد ہیں+

بورڈنگ ہوس گورنمنٹ ٹرکی کی جس قدر توجہ لڑکوں کو علمی اور عملی تعلیم دینے پر مبذول ہے اسی قدر اسکی ہمت لڑکوں کی تربیت اور درستی اخلاق پر مائل ہے۔مکاتب رشدی۔اعدادی۔اعلےٰ مکاتب۔مکتب العشایر۔اور مکتب دار الشفقہ کے ساتھ ایک ایک بورڈنگ ہوس نہایت اعلےٰ پیمانہ پر بنا ہوا ہے جس کا اہتمام اور نگرانی ایک لایق سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ میں متعلق ہے۔ہر بورڈنگ کے احاطہ میں ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے جس میں طالبعلم پانچوں وقت نماز باجماعت پڑھتے ہیں۔کھانے کا بہت اچھا انتظام ہے۔تمام طالبعلم ملکر ایک میز پر کھانا کھاتے ہیں۔ریاضت جسمانی کے واسطے مختلف کھیل کھلائے جاتے ہیں لباس بھی یکساں ہوتا ہے۔بورڈنگ ہوس کا یہ عمدہ انتظام جیسا استنبول کے مکتبوں میں مینے دیکھا تھا ویسا ہی بیروت اور دمشق کے رشدی و اعدادی مدارس میں بھی میری نظر سے گذرا۔یہ سب ایسے امور ہیں جن سے طالبعلموں میں باہم محبت و اخوت بڑھتی ہے۔اور ان کی آیندہ زندگی بہت لطف سے گذرتی ہے+

قاہرہ میں تعلیم کا انتظام بلاشبہ بہت عمدہ حالت میں ہے اور کچھ کچھ بورڈنگ ہوس کا سسٹم بھی ہے۔ مگر قسطنطنیہ اور بلاد عثمانی میں جس عمدگی اور خوش اسلوبی سے تعلیم اور بورڈنگ ہوس کا انتظام ہے۔ قاہرہ کی تعلیم اور بورڈنگ ہوس کو اس سے کچھ مناسبت نہیں۔ صرف اس قدر افسوس ہے کہ قسطنطنیہ میں عربی کی آواز بہت دھیمی ہے +

ہندوستانیوں کے پڑھنے کا انتظام میرے ایام اقامت قسطنطنیہ میں متعدد اشخاص نے پرائیویٹ خطوں اور نیز اخبار وکیل امرتسر کے ذریعہ یہ دریافت کیا تھا کہ قسطنطنیہ میں ہندوستانی لڑکوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ میں نے اس معاملہ میں محکمہ تعلیم کے چند عہدہ داروں اور خصوصاً خالص آفندی داغستانی سے جو جامع فاتح کے علاوہ ایک رشدیۂ بی مکتب میں بھی کچھ وقت پڑھایا کرتے ہیں دریافت کیا۔ ماحصل ان کے جوابوں کا یہ ہے۔ کہ ہندوستان کا جو طالبعلم اس غرض سے استنبول آنا چاہے اس کو لازم ہے کہ دولت عثمانی کے سفیر مقیم بمبئی کا ایک سرٹیفکٹ ہمراہ لائے۔ وہ اس سرٹیفکٹ کے ذریعہ اعلےٰ مکاتب کے سوا اور جس مکتب میں چاہے داخل ہو سکتا ہے +

اس طالبعلم کو ابتداءً شہر میں مکان لیکر رہنا ہوگا اور کھانے پینے کا بندوبست بھی خود ہی کرنا ہوگا۔ اس جگہ شام۔ حجاز۔ یمن۔ بغداد اور موصل تک کے طالبعلم آتے ہیں۔ اور دو دو تین تین طالبعلم ملکر مکان کرایہ پر لے لیتے ہیں۔ جن میں سے اکثر عربی اور بعض فارسی بھی جانتے ہیں پس جو ہندوستانی طالبعلم کم وبیش عربی یا فارسی جانتا ہو وہ ان لوگوں کے ساتھ ملکر رہ سکتا ہے۔ اور اگر قسطنطنیہ آنے سے پہلے

تھوڑی بہت ترکی بھی سیکھ لے تو زیادہ بہتر ہے +

جو طالبعلم بورڈر کی حیثیت سے کسی مکتب میں داخل ہونا چاہے اُس کو البتہ کسی قدر دقت ہے۔ کیونکہ سلطان المعظم کی خاص اجازت کے بغیر کوئی اجنبی بورڈر نہیں ہوسکتا۔ اور اس اجازت کے حاصل کرنے کیواسطے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن جو طالبعلم ابتداءً ڈے سٹوڈنٹ (نہاری طالبعلم) کی حیثیت سے داخل ہوکر پڑھنا شروع کرے۔ اور اس کے سرپرست اپنے دوستوں کے ذریعہ اسکے بورڈر بنانے کی کوشش جاری رکھیں تو زیادہ سہل الحصول ہے۔ مصارف کا سرسری تخمینہ پچاس روپے ماہوار کے قریب ہے +

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسافر طالبعلموں کی تحصیل علمی کا حال جب سلطان المعظم کو معلوم ہوجائے تو آپ ان کو بلا ادائے مصارف مکاتب میں داخل ہونے کی اجازت دیتے ہیں چنانچہ جاوا کے سات طالبعلم اس وقت سلطانی امداد سے مفت پڑھ رہے ہیں +

کتب خانے

علوم عربیہ کی ترقی اور کتب قدیمہ کی بہم رسانی پر ترکوں کی جو توجہ آج سے ایک مدت پیشتر تھی اُس کی شہادت استنبول کے اُن کتب خانوں سے ملتی ہے جو ترکوں نے فتح استنبول کے بعد ساڑھے چار سو برس کے عرصہ میں وقتاً فوقتاً قائم کئے۔ ان کی تعداد چوالیس تک ہے اور یہ اپنے اپنے قایم کرنے والوں کے نام سے مشہور اور شہر کی مختلف مساجد اور مدارس میں موجود ہیں +

ان کتب خانوں میں لغت - ادب - تاریخ - ریاضی - طب - حکمت - فلسفہ - تفسیر - حدیث - فقہ - عقائد - تصوف اور مختلف علوم وفنون کی نایاب کتابیں موجود ہیں جو بیشتر مکمل وصحیح وخوشخط لکھی ہوئی ہیں - یورپ کے لوگ ان کتب خانوں کو بحیثیت مجموعی فرانس اور لندن کے کتب خانوں کے بعد تیسرے درجہ پر تجویز کرتے ہیں - اور ان کا تخمینہ ہے کہ مکرر نسخوں کو چھوڑ کر ایک لاکھ بیس ہزار قلمی کتابیں استنبول میں موجود ہیں +

ترکوں کو اس وقت عربی زبان اور علوم عربیہ سے جو بے اعتنائی ہے اس کا یہ نتیجہ ہے کہ کتب خانے کس مپرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں - نہ کتابیں کسی ترتیب اور احتیاط سے رکھی ہیں اور نہ شائقین کے مطالعہ کے واسطے باضابطہ کھلتے ہیں - نہ عملہ کارکن لایق ہے - فہرست بھی اب تک صرف ہم اکتب خانوں کی چھپی ہے - منجملہ ان کتب خانوں کے کتب خانہ حمیدیہ کا انتظام البتہ اچھا ہے - جو جامع بایزید کے متصل ہے - یہاں کتابیں نہایت عمدگی سے المایوں میں رکھی ہوئی ہیں - کتب خانہ ہر روز اوقات معینہ پر کھلتا ہے - اور عملہ کارکن نہایت قابل ہے +

اخبارات

استنبول سے اخبارات اور علمی رسالے بکثرت شائع ہوتے ہیں - ترکی فرانسیسی - یونانی - ارمنی - اٹلی - جرمنی - اور انگریزی - غرض سات آٹھ زبانوں کے اخبار یہاں چھپتے ہیں +

ترکوں کی بڑی توجہ اپنی زبان پر ہے - اقدام - صباح - ترجمان حقیقت

اور معلومات یہ سب ترکی زبان ہی میں شائع ہوتے ہیں اور کثرت اشاعت میں دیگر زبانوں کے اخبارات سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اقدام کی روزانہ اشاعت دس ہزار سے کم نہیں۔ مگر فارسی کا کوئی پرچہ نہیں اور عربی کا صرف ایک اخبار المعلومات ہے۔ اس کا مالک محمد طاہر بک کردی عربی زبان سے ناآشنا ہے۔ شام کا ایک عیسائی اڈیٹر ہے۔ جس کی ماتحتی میں علمائے شام میں سے ایک شخص سید عبدالحمید زہراوی ہے جو عربی زبان اور علوم عربیہ سے خوب ماہر اور ترکی زبان عمدہ طور پر جانتا ہے +

استنبول کے اخباروں کو ملکی مضامین لکھنے میں آزادی نہیں۔ انکی نگرانی کے واسطے ایک محکمہ مقرر ہے جو اخبار شایع ہونے سے پیشتر پروف دیکھتا ہے۔ اخبار نویس کا فرض ہے کہ افسر معائنہ کی رائے کے مطابق مضامین شایع کرے۔ جب کسی اخبار نویس سے اسکی خلاف ورزی ہو تو حکومت کی طرف سے اس کو تحریری تنبیہ کی جاتی ہے اور کبھی ایک عرصہ کے لئے اس اخبار کو بند کر دیا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس قسم کے احکام اسی اخبار کے آخری پرچہ میں مشتہر کئے جاتے ہیں۔ تاکہ اس کو ندامت اور دوسروں کو عبرت ہو +

سلطنت ٹرکی کا ملکی انتظام

موجودہ حکومت کی مختصر کیفیت

ترکی کے انتظامی حالات لکھنے سے پیشتر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کے قیام اور اس کی عالمگیر فتوحات کا کچھ مختصر ذکر تمہیدی طور پر کیا جائے تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ یہ سلطنت جو اس وقت دُوَل یورپ کی مطمح نظر بن رہی ہے۔ ایک زمانہ میں کس شان و شوکت اور جاہ و جلال پر تھی۔ پھر اس میں کیا کیا تغیرات واقع ہوئے۔ اور موجودہ حالت سے آئندہ کی کیا امیدیں قائم ہو سکتی ہیں ؛

اس سلطنت کی بنیاد ابتداءً عثمان خاں غازی نے ۶۹۹ھ مطابق ۱۲۹۹ء میں ایشیا رکوچک کے اندر ایسے وقت میں ڈالی تھی۔ جبکہ قرب و جوار میں کوئی زبردست سلطنت ان کی ترقی کی مانع نہ تھی۔ خلفائے عباسیہ کی سلطنت بغداد اس سے پچاس سال پیشتر محو ہو چکی تھی۔ خلفائے بنی امیہ کی سلطنت اندلس (اسپین) گھٹتے گھٹتے غرناطہ پر پہنچ گئی۔ اور وہاں بھی نزع کی حالت میں تھی۔ مصر میں غلامان ایوبی کا خاندان فرمانروا تھا جو خلافت بنی فاطمہ کے باقیماندہ مقبوضات قایم رکھنے کو غنیمت سمجھتا تھا۔ ترکوں نے میدان خالی پاکر ایشیا افریقہ و یورپ کے براعظموں میں رفتہ رفتہ فتوحات حاصل کرنی شروع کیں۔ ۸۵۷ھ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کی فصیلوں پر اسلامی فتوحات کا جھنڈا لہرانے لگا۔ ۹۲۳ھ ۱۵۱۷ء میں بلاد شام و مصر و عرب ترکی مقبوضات میں داخل ہوئے مسلمانوں

کے مقدس مقامات مکہ معظمہ مدینہ منورہ اور بیت المقدس پر قبضہ ہونے اور بقیہ خلفائے عباسیہ سے جو مصر میں پیرزادوں کی طرح ڈیرہ ڈالے ہوئے تھے خلافت کا لقب حاصل کرنے پر انکا دینی اقتدار بھی مسلمانوں میں قائم ہو گیا۔ سلطان سلیمان ثانی کے زمانہ (۹۲۶ھ - ۹۷۴ھ مطابق ۱۵۲۰ء - ۱۵۶۶ء) میں ترکی فوج نے برلن کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ ہنگری اور بلگریڈ پر قبضہ کر لیا آسٹریا کے بادشاہ نے بڑی مشکلوں سے ویانا کو فتح ہونے سے بچایا۔ ادھر ایشیا میں بغداد آرمینیا الجزیرہ وغیرہ ملک ٹرکی میں شامل ہو گئے۔ اس وقت بری فوج کے علاوہ ترکوں کی بحری قوت اس قدر ترقی پر تھی کہ سلیمان کے جنگی جہازوں نے بحیرہ روم بحیرہ قلزم اور بحیرہ عرب کی بندرگاہوں اور جزائر پر پورا پورا تسلط کر لیا +

سولھویں صدی مسیحی تک ترکی سلطنت کی ترقی اس اوج پر تھی کہ زمانہ کی رفتار نے پلٹا کھایا۔ ایک طرف سلاطین کی عیش پرستی و بے پروائی دوسری طرف ترکوں کی نئے فنون جنگ سے ناواقفی۔ یہ دونو اسباب ایسے آکر فراہم ہوئے کہ ترکوں کے مفتوحات یکے بعد دیگرے ان کے قبضہ سے نکلتے گئے۔ اور انیسویں صدی مسیحی میں یوروپ والوں نے ٹرکی کا نام "سِک مین" بیمار آدمی رکھا۔ ۱۸۷۷ء کے جنگ روس نے تو اس کا حال اور بھی پتلا کر دیا۔ یہ انقلابات ایسے ہیں جن سے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں خاک میں مل گئیں مگر ٹرکی سلطنت کچھ ایسی خوش قسمت ہے کہ باوجود ان تغیرات کے قائم رہی۔ اور اس کی حکومت سات سو برس سے ترکوں کے ایک ہی خاندان میں چلی آتی ہے۔ جو یوروپ کی کسی سلطنت کو نصیب نہیں +

سلاطین عثمانیہ کے ایک ہی خاندان میں اس قدر عرصہ دراز تک سلطنت قائم رہنے کا سبب وہ قانون جانشینی ہے جو ترکوں میں بطور دستور العمل چلا آتا ہے۔ اس دستور العمل کا ماحصل یہ ہے کہ شاہی خاندان میں جو شخص عمر میں سب سے بڑا ہو وہ تاج و تخت کا مستحق ہوگا۔ خواہ بادشاہ کا بیٹا ہو یا بھتیجا۔ یا بھائی۔ چنانچہ سلطان عبد العزیز خان کے انتقال پر سلطان مراد تخت نشین ہوئے جو بادشاہ کے بھتیجے اور عمر میں سب سے بڑے تھے۔ اسی خصوصیت سے سلطان مراد کی معزولی پر ان کے چھوٹے بھائی سلطان عبد الحمید خان موجودہ فرمانروا خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس وقت باوجودیکہ سلطان المعظم کی اولاد نرینہ موجود ہے۔ مگر پھر بھی ولیعہد رشاد آفندی مقرر ہوئے ہیں جو ان کے چھوٹے بھائی ہیں۔ میرے سفر کے زمانہ ۱۸۹۹ء میں ان کی عمر ۵۴ سال کی تھی +

جانشینی کے مسئلہ میں پیچیدگیوں کے کم کرنے کی وجہ سے سلاطین ٹرکی نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ سلطان وقت شاہی خاندان میں نہ کسی کو لڑکی دے اور نہ کسی کی لڑکی لے۔ تاکہ کسی موقع پر داماد یا سالے کے دماغ میں ہوس شاہی پیدا ہو کر شورش کا باعث نہ ہو +

اس خاندان میں تاجپوشی (کارونیشن) کی رسم فتح قسطنطنیہ کے زمانہ سے جامع سلطان ایوب میں عمل پذیر ہوتی ہے۔ جہاں شمشیر عثمانی سلطان کی کمر میں باندھی جاتی اور تاج سر پہ پہنایا جاتا ہے +

موجودہ سلطان اور اصلاحیں

اس وقت سلطنت ٹرکی کے

فرمانروا سلطان عبد الحمید خاں ثانی ہیں جو سلطان عبد المجید خاں کے بیٹے اور خاندان عثمانی کے چونتیسویں سلطان ہیں یہ ۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں تخت نشین ہوئے۔ انکی تخت نشینی پر ملک کی حالت نہایت نازک ہو رہی تھی۔ ان سے پہلے سلاطین کی بے اعتدالیوں سے شاہی خزانہ قرضدار ہو گیا۔ جنگ روس کے ناقابل برداشت بار نے ملک کو اَور بھی قرضدار بنا دیا۔ اور بہت بڑی مصیبت پیش آئی کہ یورپین طاقتوں کی نگاہوں میں ٹرکی کا وقار گھٹ گیا۔ سلطان حال نے قابلیت خداداد سے سلطنت کی درستی پر کمر باندھی۔ ملکی اور فوجی اصلاحیں اس قدر مستعدی اور استقلال سے شروع کیں کہ مخالفین نے اُن کی اولوالعزمی اور دانشمندی کا اعتراف کیا۔ اور یورپین مدبروں کو اپنا دیا ہوا نام مردِ بیمار بمجبوری واپس لینا پڑا ۔

اس زمانہ میں باہمی رقابت کی پالیسی اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتوں کو فوجی اور دیگر اصلاحوں کے عمل میں لانے کیواسطے کثیر رقمیں قومی قرضہ میں لینی پڑتی ہیں۔ مگر سلطان المعظم نے اپنے اس عہد حکومت میں جنگی اور دیگر اعتبارات سے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے اس کے لئے نہ صرف انہوں نے اپنے آپ کو قرضہ لینے سے بچایا۔ بلکہ پچھلے قرضہ کا ایک بہت بڑا حصہ سر سے اُتار چکے ہیں۔ یونان کی جنگ ۱۸۹۷ء نے یورپ کو پورا یقین دلا دیا ہے کہ زبردست سے زبردست سلطنت بھی تنہا اس بیمار آدمی کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔ ملک کے اندرونی انتظامات میں جو روزافزوں ترقی ہو رہی ہے۔ اسکی تفاصیل میں سلمانوں کے علاوہ یورپ کے نامور سیاحوں

شل پروفیسر ڈیمبری اور پروفیسر میکس مولر نے چشم دید حالات لکھکر دنیا کو تبلادیا ہے کہ ہمارے زمانہ میں ٹرکی کی سلطنت شایستگی اور خوش انتظامی میں کیسی ترقی کر رہی ہے +

سلطان المعظم کا سالانہ ذاتی خرچ دس لاکھ پونڈ ڈیڑھ کروڑ روپیہ) سے زیادہ بیان کیا جاتا ہے - یورپین اخبار نویس ان مصارف کا حال سن کر سلطان کو عیش پسند قرار دیتے ہیں - مگر یہ ان کی محض ناواقفی یا تعصب مذہبی ہے - ان اخبار نویسوں کو بخوبی معلوم ہونا چاہئے کہ آپ اسی روپیہ سے اپنے تمام متوسلین کی پرورش کرتے ہیں - جن کی تعداد پانچ ہزار سے کم نہیں اور اسی روپیہ میں سے رفاہ عام کے کاموں میں بھی رقم کثیر صرف کرتے ہیں - مکتبوں اور تکیوں کی جو امداد سلطان المعظم کر رہے ہیں اس کا مختصر حال اپنے اپنے موقعہ پر لکھا جاچکا - اس جگہ ان رقوم کی ایک مجموعی تعداد درج کی جاتی ہے - جو آپ نے اب تک اپنے عہد حکومت میں رفاہ عام کے کاموں پر صرف کیں +

نمبر شمار	نام مد	تعداد روپیہ	نمبر شمار	نام مد	تعداد روپیہ
۱	مساجد	۱۵ لاکھ ۷۷ ہزار ۳۲۹	۷	قبرستان	۱ لاکھ ۲۳ ہزار ۸۷
۲	مدارس	ایک لاکھ ۹۱ ہزار ۳۳۳	۸	خیراتی عمارتیں	۵۸ ہزار ۳۲۹
۳	مکاتب	۷۲ ہزار ۳۳۹	۹	چشمے اور سبیلیں	۴۴ ہزار ۵۸۴
۴	تکیے	۲ لاکھ ۶۲ ہزار ۹۶۵	۱۰	آبرسانی کے سامان	۱۰ لاکھ ۱۵ ہزار ۳۳۷
۵	ہسپتال	۴۷ ہزار ۸۲۲	۱۱	گھنٹہ گھر	۵ ہزار ۶۲
۶	کتبخانے	۲۰ ہزار ۹۸۸	۱۲	عام وقفی جایدادیں	۹۳ ہزار ۲۱۷

۱۳- مشروط وقفی جایدادیں ۵۸ ہزار ۶۸۲	۱۴ مساجد اور خیرات کے دیگر صیغے ۳ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۲۶

ان تمام رقوم کا مجموعہ ۳۸ لاکھ ۸۳ ہزار روپیہ کے قریب ہوتا ہے +

سلطانی فیاضی

سلطان المعظم کی یہ فیاضی بلاد عثمانی ہی تک محدود نہیں بلکہ ممالک غیر کے شرفا اہل علم اور عام مسافر بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ سرائے یلدز کے متصل ایک عظیم الشان مسافرخانہ بنا ہوا ہے۔ جو حاجتمند باہر سے آتے ہیں اُن کو اس مسافرخانہ میں جگہ دی جاتی ہے۔ اور جب تک ان کی حاجت برآری نہو وے وہ شاہی مہمان متصور ہوتے ہیں۔ جو شخص زاد راہ کا خواستگار ہو اس کو جہاز کا کرایہ مع مصارف سفر کے عطا ہوتا ہے۔ دفتر مابین ہمایونی کے میر منشی کو سلطان المعظم کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہے کہ پانچ پونڈ تک اپنی تجویز سے کسی کو دیدے۔ دس پونڈ تک غازی عثمان پاشا سے اجازت لینے کی ضرورت ہے۔ اور جب کسی کو اس سے زیادہ امداد کی ضرورت ہو تو سلطان المعظم کے حضور سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ اہل علم کو تمغے اور معقول رقمیں بطور اعانت دی جاتی ہیں۔ تارک الوطن شرفا کے مصارف کیواسطے ہر ایک کی حالت کے موافق نقد پنشن مقرر ہوتی ہے۔ انیسویں صدی کے مشہور فاضل اور نامور سیاح سید جمال الدین افغانی جب استنبول میں آئے تو ستّر پونڈ ماہانہ ان کا وظیفہ مقرر ہوا۔ سردار غلام محمد خان طرزی رئیس افغانستان کو ۴۰ پونڈ وظیفہ ملا۔ شمالی ہند کے ایک صاحب محمد بیگ کو پندرہ پونڈ ماہوار ملتے ہیں۔ غرض اس قسم کے بیسیوں شرفا اور اہل علم ہیں جنکا نام استنبول کے شاہی وظیفہ خواروں میں درج ہے۔ اسلامی دار الخلافہ کی یہ فیاضی ایسی ہے۔ جس کی نظیر یورپ کی سلطنتوں میں آج تک

کہیں سننے میں نہیں آئی +

ان شاہی فیاضیوں کے ضمن میں اس امر کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ایران اور ہندوستان کے متعدد مسلمان اچھی اچھی تنخواہوں پر استنبول میں نوکر ہیں۔ جن ہندوستانیوں سے میری ملاقات ہوئی ان کے نام نظیر کے طور پر اس جگہ درج کئے جاتے ہیں +

نمبر شمار	نام ملازم	نام محکمہ	تنخواہ
۱	مولوی محمد صادق	انجمن معارف	۴۰ پونڈ
۲	ڈاکٹر مرزا اکبر بیگ (لاہوری)	میڈیکل ڈپارٹمنٹ	۲۰ پونڈ
۳	ڈاکٹر منشی امیر علی (بہاری)	طبیب شاہی	۲۰ پونڈ
۴	حکیم مولوی عبد الحکیم (ملتانی)	طبیب شاہی	۲۰ پونڈ
۵	منشی نصرت علی خاں (دہلوی)	انجمن معارف	۱۰ پونڈ
۶	بابو اصغر علی (بنگالی)	فارن آفس	{تنخواہ زیر تجویز ہے

ان کے علاوہ حاجی حسن آفندی ساکن بمبئی اور تحسین آفندی شیخ تکیہ ہندیہ کے بیٹے دفاتر میں اور سردار غلام محمد خاں طرزی کا پوتا پولیس میں نوکر ہیں +

طرز حکومت

سلطنت ٹرکی کا انتظام ایک ایسی مجلس کے متعلق ہے جس کے ممبر اعلےٰ درجہ کے تعلیم یافتہ روشن خیال پولیٹکل امور سے پوری طرح باخبر ہیں اور سلطان المعظم کے زیر نگرانی کام کر رہے ہیں۔ اس کونسل کے دس رکن ہیں جنکے عہدوں کے نام حسب ذیل ہیں:۔

صدر اعظم۔ شیخ الاسلام۔ سر عسکر پاشا۔ ناظر بحریہ۔ ناظر داخلیہ۔ ناظر خارجیہ

ناظرِ عدلیہ - ناظرِ اوقاف - ناظرِ معارف - ناظرِ امور نافعہ - ان میں سے پہلے دو عہدہ دار میر مجلس اور باقی آٹھوں ارکان مجلس ہیں - ہر ایک رکن کی خدمات کی تفصیل حسب ذیل ہے :-

(۱) صدر اعظم (پرائم منسٹر) اس شخص کو امور دنیاوی میں سلطان کی طرف سے نائب السلطنت کا رتبہ حاصل ہے - مجلس کی صدارت اس کے متعلق ہے ملکی اور مالی حکام جس قدر مقرر ہوتے ہیں اُن کی تقرری صدر اعظم کی منظوری سے عمل میں آتی ہے +

(۲) شیخ الاسلام - یہ شخص دینی امور میں مسلمانوں کا حاکم اور صدر اعظم کی غیر حاضری میں میر مجلس کا کام کرتا ہے - قاضیوں اور مشائخ اور محاکم شرعیہ اور مدارس دینیہ کی نگرانی اس کے متعلق ہے +

(۳) سر عسکر (وزیر حرب) تمام فوجی کاروبار اس کے متعلق ہیں +

(۴) ناظر بحریہ (وزیر بحر) سلطنت کے ملکی اور جنگی جہازات اور کارخانہ جہاز سازی کا افسر ہے +

(۵) ناظر داخلیہ (ہوم منسٹر) تمام اندرونی معاملات اس کے متعلق ہیں - انتظامی عہدہ داروں کی تقرری اس کے ہاتھ میں ہے +

(۶) ناظر خارجیہ (فارن منسٹر) تمام بیرونی معاملات اور دُوَل اجنبیہ سے خط و کتابت سفیروں اور قونصلوں کی تقرری اس کے ہاتھ میں ہے +

(۷) ناظر عدلیہ (جوڈیشل منسٹر) دیوانی اور فوجداری کے جس قدر محکمے یورپین اصول پر قایم ہیں ان کے کارکنوں کی تقرری اس کے ہاں سے عمل میں آتی ہے +

(۸) ناظر اوقاف جس قدر اوقاف مسجدوں تکیوں۔ پلوں اور چشموں وغیرہ کے متعلق ہیں۔ اور جو خیرات حرمین شریفین۔ بیت المقدس۔ اور زیارات متبرکہ میں بھیجی جاتی ہے۔ ان سب کا انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے +

(۹) ناظر معارف (ڈایرکٹر سررشتہ تعلیم) سررشتہ تعلیم کا کام اس کے متعلق ہے +

(۱۰) ناظر نافعہ (پبلک ورکس منسٹر) تجارت سڑکیں ریلوے وغیرہ امور اس کے متعلق ہیں +

یہ مجلس جس جگہ اجلاس کرتی ہے۔ اس کا نام "باب عالی" ہے۔ دونوں میر مجلس اور آٹھوں ممبروں کے دفاتر بھی اسی باب عالی میں ہیں۔ تحقیقات اور مباحثہ کے بعد صدر اعظم ان کاغذات کو مابین ہمایونی (دربار شاہی) میں بھیجدیتا ہے وہاں کا باش کاتب (میر منشی) ان تمام کاغذات کو پڑھ کر خلاصہ چھانٹتا ہے۔ اور اس خلاصہ کو مع اصل کاغذات کے حضرت سلطان المعظم کے حضور پیش کرتا ہے۔ اور جب دستخط مبارک ثبت ہوجائیں۔ تو کاغذات باب عالی میں براد اجرائے احکام واپس جاتے ہیں۔ تجاویز مندرجہ باب عالی کے ساتھ اتفاق اکثر اور مخالفت کمتر ہوتی ہے +

ملکی حکام

ٹرکی کے کل مقبوضات جن میں یورپ ایشیا اور افریقہ کے ممالک مفتوحہ شامل ہیں۔ تیس صوبوں پر منقسم ہیں۔ ہر ایک صوبہ کو ولایت کہتے ہیں۔ اور حاکم صوبہ کو والی جو گورنر کا مترادف ہے۔ مثلاً حجاز۔ یمن۔ بصرہ بغداد۔ بیروت وغیرہ ایک ایک ولایت ہے اور وہاں کا حاکم والی۔ ہر والی کے ماتحت متعدد حاکم عامل جدا جدا شہروں اور قصبوں میں اس تفصیل سے مقرر

ہیں - (۱) متصرف یعنی کمشنر (۲) قائم مقام یعنی ڈپٹی کمشنر (۳) مدیر یعنی تحصیلدار -
اس وقت ۳۰ والی - ۲۲ متصرف - ۹۰۰ قائم مقام اور اس سے بہت زیادہ
تعداد کے مدیر ممالک ٹرکی میں کام کر رہے ہیں - ان کی ماہواری تنخواہیں حسب
ذیل ہیں :-

والی ۱۵۰ پونڈ عثمانی سے ۲۵۰ پونڈ عثمانی تک +

متصرف ۳۵ پونڈ عثمانی سے ۷۵ پونڈ تک +

قائم مقام ۱۲ پونڈ سے ۲۵ پونڈ تک +

مدیر ۵ پونڈ سے ۹ پونڈ تک +

والی اور اس کے ماتحت انصرام خدمات میں ناظر داخلیہ کے تابع احکام ہیں
ملک کے اندرونی معاملات خواہ کسی قسم کے ہوں - والی ان کا نگران اور ہر
حالت میں نیک و بد کا ذمہ دار ہے - محکمہ جات افتار - اوقاف - تعلیم - تعمیرات
پولیس - شفاخانہ - جنگلات وغیرہ کے جس قدر حاکم اور عہدہ دار والی کی
حدود ارضی کے اندر ہوں - اُن کی نگرانی والی کے متعلق ہے - جب کسی عہدہ دار
کی بد انتظامی ظاہر ہو تو مدیر قائم مقام کو اور قائم مقام متصرف کو اور متصرف والی کو رپورٹ کرتا ہے
اور والی ضروری تحقیقات کے بعد اس رپورٹ کو ناظر داخلیہ کے پاس بھیج دیتا
ہے - اور ناظر داخلیہ محکمہ متعلقہ میں روانہ کرتا ہے - مثلاً اگر مفتی یا قاضی کی
شکایت ہو - تو کاغذات شیخ الاسلام کے پاس جائینگے - اور اگر مکتب کی کچھ
شکایت ہو - تو ناظر معارف کے پاس اور ہر قسم باقی شکایات اپنے اپنے ٹھکانوں
پر روانہ ہونگی - یہ کاغذات بعد تحقیقات کے صدر اعظم روبرو پیش ہونگے - اور نتیجہ

تحقیقات کے موافق حکم صادر ہوگا - اگر شکایت اہم ہو تو تجویز سزا کی رپورٹ سلطان المعظم کے حضور میں بھیجی جاتی ہے - اور اس کا انفاذ بعد منظوری سلطانی کے عمل میں آتا ہے +

اکثر عہدہ داروں کی بحالی بہ خاشتگی چونکہ وزرا مجلس باب عالی کے متعلق ہے - اس واسطے امیدواران خدمت اور عہدہ داران زیر عتاب کا ایک مجمع استنبول میں حاضر رہتا ہے - اور بعض آدمی انتظار حکم میں برسوں پڑے رہتے ہیں - جس میں طرابلس الغرب - شام - حجاز - یمن - عراق اور موصل کے سینکڑوں عرب پائے جاتے ہیں - محلہ چنبرلی طاش جو استنبول میں جامع ایا صوفیا کے قریب ہے - عربوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے - اردگرد کے قہوہ خانوں اور دوکانوں میں جہاں تہاں دیکھو عرب ہی عرب نظر آتے ہیں +

عدالتیں

حجاز - نجد - یمن کے سوا باقی تمام بلاد عثمانیہ میں مسلمانوں کے علاوہ بیشمار عیسائی اور کسیقدر یہودی رعایا موجود ہے - یہ عیسائی اور یہودی اکثر تو ٹرکی کی رعایا - اور بعض غیر سلطنتوں کے تابع ہیں - پھر عیسائیوں میں انواع واقسام کے متعدد فرقے مثل رومن کیتھلک - پروٹسٹنٹ اور گریک چرچ کے پیرو پائے جاتے ہیں - اور یہ تعدد فرق کچھ عیسائیوں پر ہی منحصر نہیں - بلکہ مسلمانوں میں بھی مذاہب اربعہ کے سوا جعفری وہابی - دُرزی - زیدی وغیرہ فرقے موجود ہیں +

اس مختلف المذاہب رعایا کی داد رسی اور حفظ امن کیواسطے جس قدر محاکم یعنی عدالتیں مقرر ہیں بہیئت مجموعی اس کی دو قسمیں ہیں +

۱- محاکم شرعیہ- یہ عدالتیں صرف مسلمانوں کے واسطے ہیں- اور ان کے حاکم بھی مسلمان ہیں- جن کو قاضی کہتے ہیں- اس قاضی کا رتبہ تنخواہ اور اختیارات کے لحاظ سے ایسا سمجھنا چاہئے- جیسا ہندوستان میں منصف اور سب جج کا- مسلمانوں کے جملہ دیوانی مقدمات اسی محکمہ میں دائر ہوتے ہیں- اگر مقدمہ معمولی ہو تو قاضی خود ہی اس کا فیصلہ کر دیتا ہے- اگر پیچدار ہو تو مفتی سے فتوے لینا پڑتا ہے- اور اس فتوے کے موافق حکم دیتا ہے- یہ مقدمہ خواہ قاضی نے اپنی تجویز سے- یا مفتی کے فتوے کے موافق فیصل کیا ہو- ہر فریق مقدمہ کو اختیار ہے کہ بصورت ناراضی عدالت شیخ الاسلام میں نظرثانی کرے +

بلاد عثمانیہ کے ہر شہر میں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ایک قاضی- اور اکثر بڑے شہروں میں ایک مفتی بھی ہوتا ہے قاضی کیلئے مکتب نواب کا سندیافتہ ہونا لازم ہے- مگر مفتی کیواسطے کسی سرٹیفکٹ کی ضرورت نہیں اسکو شہر کے باشندے منتخب کرتے ہیں- اور اکثر اس منصب پر وہ شخص مقرر ہوتا ہے جو مشاہیر علماء میں سے ہو- قاضی کی تنخواہ نوے روپیہ سے شروع ہوتی ہے اور ۶۲۵ روپیہ تک پہنچتی ہے- مفتیوں کو اوقاف سے معاش ملتی ہے +

۲- محاکم نظامیہ- یہ عدالتیں سلطنت عثمانی کی ہر قسم کی رعایا کے واسطے مقرر ہیں- ان عدالتوں کے قانون یوروپ کے قوانین سے ماخوذ ہیں- اور دیوانی و فوجداری دونوں قسم کے مقدمات ان میں دائر ہوتے ہیں- یہ عدالتیں ہر صوبہ کمشنری اور ڈپٹی کمشنری کے صدر مقام پر موجود ہیں- باستثنا ان شہروں کے جہاں غیر مذہب کا کوئی آدمی نہ ہو- ہر محکمہ میں چار آدمی کام کرتے ہیں- دو ان میں سے مسلمان ہوتے ہیں- اور دو غیر مذہب کے- ان چاروں پر ایک مسلمان رئیس ہوتا ہے جس کے

واسطے لازم ہے کہ اس نے مکتب حقوق (لاکالج) کا سرٹیفکٹ حاصل کیا ہو + یہ عدالتیں ابتدائی ہیں۔ اور ہر ایک ولایت کے صدر مقام میں ان کی عدالت ہائے اپیل مقرر ہیں۔ اور دونوں قسم کی عدالتوں کی نظر ثانی کے واسطے آستانہ میں محکمہ نظر ثانی موجود ہے +

۳۔ محاکم قونصلیہ۔ سلطنتوں کے باہمی قول و قرار کے رو سے ٹرکی کے وہ باشندے جو رعایائے غیر ہیں۔ اپنی سلطنتوں کے قوانین کے پابند ہیں۔ اور ان کے جملہ مقدمات قونصلوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ مگر اراضیات کے معاملات میں ہر قسم کے باشندے خواہ وہ رعایائے غیر ہی کیوں نہوں قوانین ٹرکی کے تابع ہیں۔ مقدمات اراضی اور مقدمات مابین رعایائے سلطان اور رعایائے قوم اجنبیہ محاکم نظامیہ میں فیصل ہوتے ہیں۔ پیشی مقدمہ کے وقت غیر سلطنت کا قونصل ٹرکی عدالت میں اپنا ایک وکیل بھیج دیتا ہے۔ جو خیال رکھتا ہے۔ کہ اس کے ملک کی رعایا کے ساتھ کوئی خلاف قانون کارروائی عمل میں نہ لائی جائے۔ اسکی رائے میں اگر کوئی امر قابل توجہ ہو۔ تو وہ اسے عدالت کے نوٹس میں لے آتا ہے +

جنگی حالت

وہ قوت جس کے باعث ترکوں کو کسی زمانہ میں فتوحات نمایاں حاصل ہوئیں۔ اور جن کا ذکر سنکر یوروپ کے نامور سلاطین بھی تھرا گئے۔ وہ ترکوں کی جنگی قوت تھی۔ ترک ہمیشہ سے نہایت جنگ جو دلیر اور جنگی خدمات کے لئے ہرطرح سے قابل چلے آتے ہیں۔ اور قدیمی شجاعت اب تک ان میں پائی جاتی ہے۔ گذشتہ زمانہ میں جو بمقابلہ دول یوروپ ترکوں کو ہزیمتیں اور بعض حصص ملک کا ان کے ہاتھ سے نکل جانا صفحۂ تاریخ پر دکھائی دیتا ہے۔ اس کا باعث ترکوں کا ضعف نہ تھا۔ بلکہ دول یوروپ کا جدید فنون جنگ سے واقف ہونا۔ اور ترکوں کی عدم واقفیت تھی۔ مگر اس نقص کے رفع کرنے میں سلطان عبدالحمید خان سلطان حال نے جو قابلیت اور بیدار مغزی دکھائی ہے وہ ہزار۔ تحسین کے قابل ہے۔ اب ترک یوروپین طریقۂ جنگ سے خوب ماہر ہیں۔ چنانچہ روم و یونان کی گذشتہ لڑائی میں جس عمدگی سے ترک قواعد جدیدہ کو کام میں لائے وہ ساری دنیا پر روشن ہے +

ترکی فوجوں کی تعداد اس وقت ۱۲ لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ مگر اصل یہ ہے۔ کہ اس تعداد کا یقینی علم سوائے خاص خاص ارکان سلطنت کے خود ترکوں کو بھی نہیں۔ کیونکہ ترکی میں تمام جنگی امور سلطنت کا راز سمجھے جاتے ہیں۔ فوجی تعداد اطراف ملک میں اس کی تقسیم۔ فوجی نقل و حرکت حتٰے کہ افسروں کی تنخواہیں بھی مخفی رکھی جاتی ہیں لیکن ترکوں کی جنگی چھاونیاں جہاں ان کی

فوجیں مقیم ہیں۔ بروے تحقیقات حسب ذیل دریافت ہوئی ہیں۔

استنبول۔ ادرنہ۔ مناشر۔ ارزنجان۔ شام۔ بغداد۔ صنعا یمن۔ علاوہ بریں کچھ کچھ فوجیں کریدا اور طرابلس الغرب میں بھی رہتی ہیں +

سلطنت عثمانیہ میں ہر بالغ مسلمان پر جنگی خدمت لازم ہے۔ ۲۰ سال کی عمر میں وہ فوج میں بھرتی ہوتا ہے۔ اور ۶ سال تک فوجی خدمات کرتا ہے۔ اور پھر آزاد ہے۔ آزادی سے ۸ سال تک اگر کوئی جنگ پیش آئے تو اس سے جنگی خدمات لیجا سکتی ہیں اور بعد ازاں اس سے کچھ سروکار نہیں۔ ان لوگوں کو خوراک اور لباس وغیرہ خزانہ شاہی سے ملتا ہے۔ اور جیب خرچ کے لئے ایک مجیدی ماہوار جو ہمارے ہاں کے ۱؎ کے برابر ہوتا ہے۔ غیر مسلم قومیں جنگی خدمت سے معاف ہیں اور اس کے عوض ۱ شلنگ یا للعہ سالانہ ان سے لیا جاتا ہے۔ جس کی نسبت مذہبی خادم سفارش کرے اُس سے یہ رقم بھی نہیں لی جاتی۔ تخمینہ کیا گیا ہے۔ کہ اس طریق پر عمل کرنے سے آیندہ چند سالوں میں قلمرو عثمانیہ میں ایک مسلمان جوان بھی ایسا نہ رہیگا۔ جو فنون جنگ سے واقف نہ ہو +

جو مسلمان اپنی خانگی ضروریات کے باعث اس خدمت سے مستثنےٰ ہونا چاہے۔ اسے لازم ہے۔ کہ پچاس پونڈ عثمانی بطور معاوضہ ادا کرے۔ لیکن اگر درخواست کنندہ کسی معزز رکن سلطنت کا بیٹا یا قریبی ہو تو باوجود ادائے معاوضہ پھر بھی اس کو تین ماہ تک قواعد سیکھنی ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قسطنطنیہ کے باشندے دارالخلافہ کے اعزاز کے باعث اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے رہنے والے ان شہروں کے احترام کے باعث اس خدمت سے مستثنےٰ ہیں۔ ہر شہر میں

مذہبی مدرسوں اور مسجدوں کے طلبار بھی جو کتب دینی میں ایک خاص امتحان پاس کر لیں۔ فوجی خدمت سے معاف کئے جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی ماں یا بہن یا بیوی یا بوڑھے باپ کے تنہا متکفل ہوتے ہیں۔ وہ بھی اس پابندی سے آزاد کئے جاتے ہیں +

ترک سلطان کو اپنا آقا اور رسول صلعم کا جایز جانشین اور خادم حرمین شریفین سمجھ کر ہر ایک لڑائی کو مذہبی لڑائی سمجھتے ہیں۔ یہ مذہبی جوش اعلےٰ افسر سے لیکر ادنےٰ سپاہی تک کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی جوش کے باعث ترکوں نے باوجود مخالفت دول یورپ کے اپنے ملک کو قائم رکھا ہوا ہے۔ یہ مشہور ہے۔ کہ سلطان کی بحری طاقت بہت کمزور ہے۔ مگر اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ کیونکہ آبنائے ڈارڈینلز اور باس فورس میں جو استنبول کے دہانے ہیں بحری استحکامات کا پورا انتظام ہے جیسا کہ پہلے مذکور ہو چکا ہاں بمقابلہ دیگر سلطنتوں کے کمی ضرور ہے۔ جس سے سلطان المعظم بے فکر نہیں ہیں۔ اور ہر آئے دن نئے نئے جہازات خریدے اور بنوائے جاتے ہیں۔ استنبول میں ایک بہت بڑا سرکاری کارخانہ جہازوں کی مرمت اور نئے جہازوں کی تیاری کے لئے بنایا گیا ہے۔ جسے ترسانہ کہتے ہیں۔ اور اسی قسم کا ایک چھوٹا سا ترسانہ سمرنا میں بھی قایم کیا گیا ہے +

استنبول والے ترسانہ کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ تعمیر و مرمت جنگی جہازات کے لئے مخصوص ہے۔ اور دوسرا توپیں اور گولے ڈھالنے کے لئے۔ جب کوئی جہاز تیار ہونے کو ہوتا ہے تو پہلے اس کا نقشہ کاغذ پر کھینچا جاتا ہے۔ پھر اس

نقشے کے مطابق جہاز کا ایک چھوٹا سا نمونہ لکڑی کا بنایا جاتا ہے۔ جو سلطان المعظم کے روبرو پیش کیا جاتا ہے۔ اور بعد منظوری سلطان اصل جہاز کی تعمیر کا حکم دیا جاتا ہے۔ ترسانہ کے علاوہ قسطنطنیہ میں دو اَور کارخانے توپ گولے گولیاں وغیرہ تیار کرنے کی غرض سے موجود ہیں۔ ان تمام کارخانوں میں نہایت اُستادی اور کاریگری سے کام ہوتا ہے۔ ان کارخانوں میں کام کرنے والے فوجی لوگ ہیں۔ جو سب کے سب ترک ہیں۔ نہایت قابل تعریف بات ان کے متعلق یہ ہے کہ ہر کارخانہ کے ساتھ ایک مدرسہ ہے۔ جس میں عموماً یتیم و محتاج لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔ جو دن کے کچھ حصے میں لکھنے پڑھتے ہیں۔ اور باقی سارا دن کارخانہ میں کام کرتے ہیں +

اسی سلسلہ میں یہاں کے سرکاری فَیس خانے کا ذکر کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا جہاں ترکی ٹوپیاں۔ بنیاِنیں۔ جرابیں وغیرہ تیار ہوتی ہیں۔ چونکہ یہاں کی تیار شدہ چیزیں صرف فوجی ضروریات ہی کے لئے کافی ہوتی ہیں۔ اور ملک کی تجارت میں یہ کارخانہ کوئی حصہ نہیں لیتا۔ اس لئے اس کا ذکر جنگی کارخانوں کے تحت میں آنا ہی زیادہ مناسب ہے +

ریل

ترکی سلطنت کے اکثر بڑے بڑے شہروں میں ریل جاری ہے۔ قسطنطنیہ سالونیکا۔ بروصہ۔ سمرنا۔ مناستر۔ مرسینا۔ انگورہ۔ بیروت۔ دمشق یافہ و بیت المقدس میں اس کے علیحدہ علیحدہ ٹکڑے ہیں۔ ان میں سے کسی کا طول ساڑھے تین سو میل سے زیادہ نہ ہوگا۔ بعض ٹکڑے ترکی گورنمنٹ کی ملکیت اور بعض کمپنیوں کی ملکیت ہیں۔ انجن ولایت سے بنکر آتے ہیں اور

گاڑیاں اسی ملک میں تیار ہوتی ہیں۔ مجھے دوران سفر میں بیروت و دمشق ریلوے پر سفر کرنے کا اتفاق ہوا جس کا حال ملک شام کے ذیل میں درج کیا جائیگا +

استنبول سے ایک لائن فرانس کو جاتی ہے۔ جو اڈریانوپل۔ فلپ پولی صوفیا۔ نش۔ بلگریڈ۔ بوڈاپسٹ۔ اور ویننا (دارالحکومت اسٹریا) کو طے کرتی ہوئی بہتر گھنٹے یا تین دن رات میں پیرس پہنچتی ہے۔ اس لائن کا نام اورینٹل اکسپریس (مشرقی ڈاک گاڑی) ہے +

ان دنوں ایک اور لاین بنانی تجویز ہوئی ہے جو دمشق سے مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ ہوتی ہوئی صنعا یمن تک جائیگی۔ اس کا طول ڈیڑھ ہزار میل کے قریب ہوگا اور ترکی سلطنت کے روپیہ اور اہتمام سے بنے گی۔ اس سے حاجیوں کے آرام و آسایش کے علاوہ تجارت اور سیاسی معاملات کو بہت ترقی ہوگی +

بغداد سے دمشق تک بھی ایک لاین بننے کی خبر ہے۔ جو جرمنی کمپنی کے ذریعہ تیار ہوگی۔

تار

قسطنطنیہ سے ترکی کے اکثر بڑے بڑے شہروں تک تار کا سلسلہ قائم ہے جس کا طول کئی ہزار میل ہوگا۔ بحری لائن سے ایشیا یورپ و افریقہ تک خبر رسانی ہوتی ہے۔ غرض کہ خشکی اور تری کے دور دراز حصوں کی خبریں تار کے ذریعہ دارالخلافہ تک پہنچتی رہتی ہیں +

ڈاک

ڈاک خانہ کا انتظام خاص قسطنطنیہ اور سلطنت ٹرکی کے دیگر شہروں میں جہاں تک مجھے سیر کرنے کا اتفاق ہوا اچھی ترقی پر ہے

شہروں اور قصبوں کی ڈاک تو رات دن تقسیم اور روانہ ہوتی رہتی ہے۔ مگر ہندوستان اور ممالک غیر کی ڈاک ہفتہ میں صرف ایک دن آتی اور ایک ہی دن روانہ ہوتی ہے۔ چٹھیوں کی رجسٹری۔ اور پارسل ومنی آرڈر کی روانگی کا انتظام بھی ہے۔ مگر غیر ملکوں میں وی۔پی بھیجنے کا دستور نہیں +

یہاں کے انتظام ڈاک میں دو تین امور کسی قدر حیرت انگیز نظر آئے +

(۱) قسطنطنیہ بیروت۔ازمیر وغیرہ شہروں میں جہاں جہاں دُول اجنبیہ کے قونصل رہتے ہیں ترکی ڈاک خانوں کے علاوہ ہر سلطنت کا اپنا ایک علیحدہ ڈاک خانہ ہے دول اجنبیہ کی رعایا اپنے خطوط وپیکٹ انہی ڈاکخانوں کے ذریعہ روانہ کرتی اور منگواتی ہے۔ ان ڈاک خانوں میں خطوں کی تقسیم چپراسی کے ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ لوگ خود ڈاک خانہ میں جاکر اپنے اپنے خط اور پیکٹ لے آتے ہیں

(۲) خاص قسطنطنیہ میں ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں خطوں کے تقسیم کرنیکا کوئی انتظام ڈاک خانہ کے ذریعہ نہیں +

(۳) ممالک غیر کے اخبار اور کتابیں جو ترکی ڈاک خانوں کے ذریعہ قسطنطنیہ میں آتی ہیں وہ انجمن معارف میں بھیجدی جاتی ہیں۔اس انجمن میں متعدد زبانوں کے جاننے والے اہلکار موجود ہیں۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اگر ان کی رائے میں مضامین مندرجہ اخبار وکتب مسلمانوں کے مذہبی خیالات اور ترکی سلطنت کے پولٹیکل معاملات کے خلاف نہ ہوں تو مکتوب الیہم کو تقسیم ہوتی ہیں۔ ورنہ ضبط کی جاتی ہیں +

تیسرا حصّہ

ملک شام کے حالات

بیروت کا سفر

جب میں استنبول اور اُس کے اطراف کی اچھی طرح سیر کر چکا تو شہر دمشق کے دیکھنے کا شوق پیدا ہوا جو دنیا کے بہت پرانے شہروں میں ہے اور ابتدا سے اسلام سے تہذیب و تمدن اور علم و فضل کا مرکز رہا ہے یہ ارادہ کر کے میں ۱۲- اکتوبر بجمعرات کے دن استنبول کی بندرگاہ پر پہنچا - جہاں مال پڑتال کرنے کے بعد مسافروں کو جہاز پر سوار ہونے کی اجازت ملتی ہے ؛

بندرگاہ پر پڑتال کنندہ ایک مسلمان ترک تھا - اس نے میرا صندوق کھولکر صرف کتابیں نکال لیں - اور ایک ایک کتاب کا سرورق پڑھتا گیا - اور ایسے نازک وقت میں جبکہ جہاز چلنے کو تھا مجھے سوار ہونے کی اجازت ملی - اگرچہ اس قسم کی سخت پڑتال سے مسافروں کو بالطبع رنج ہوتا ہے مگر ترکوں کو مقامی مصلحتیں ایسے قوانین جاری کرنے پر مجبور کرتی ہیں ؛

ہمارا جہاز ازمیر ہوتا ہوا چار دن کے عرصہ میں بیروت پہنچا - اس کا کرایہ استنبول سے بیروت تک حسب ذیل ہے :-

درجہ اول ۱۶۲ فرنک ([illegible])
درجہ دوم ۱۰۴ فرنک ([illegible])
درجہ متوسط ۶۵ فرنک ([illegible])
درجہ سوم ۲۱ فرنک ([illegible])

بیروت

شہر کی اجمالی حالت

یہ شہر دمشق کا بندرگاہ اور تجارتی حیثیت میں ایشیاء کوچک کے تمام شہروں سے دوسرے درجہ پر ہے جب سے والی (گورنر) کا صدر مقام قرار پایا ہے اُس وقت سے اس کی رونق اور بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہوگی جس میں سے آٹھواں حصہ مسلمان اور باقی عیسائی ہیں۔ قُرب ساحل کے باعث یہاں کی آب و ہوا صحت بخش سمجھی گئی ہے۔ اور بہت جگہوں کے لوگ تبدیل ہوا کی غرض سے یہاں آتے ہیں +

رونق اور خوبصورتی کے اعتبار سے بیروت کا حال دیگر مشرقی شہروں کی مانند ہے۔ قدیم آبادی کے گلی کوچے میلے اور سڑکیں ناہموار ہیں۔ مگر نیا حصہ نہایت پرفضا۔ سڑکیں عمدہ اور کشادہ۔ عمارتیں شاندار اور اُجلی۔ ہوٹل۔ قہوہ خانے اور تھیٹر جابجا موجود ہیں۔ باغات کی سبزی سے شہر کی رونق دوبالا ہوگئی ہے۔ شہر کے باشندوں کی زبان عربی ہے۔ لباس اور وضع بھی عربوں ہی کے قریب قریب ہے۔ نئے تعلیم یافتوں میں البتہ کوٹ اور پتلون کا رواج بڑھتا جاتا ہے +

علمی ترقی

انیسویں صدی کے اندر جس قدر حیرت انگیز ترقی عربی زبان اور علوم جدیدہ میں باشندگانِ بیروت نے کی ہے۔ اُس کی نظیر مشرقی دنیا میں شاید ہی کہیں ملیگی۔ مگر یہ ترقی جو کچھ ہے عیسائیوں کے باعث سے ہے۔ یہ عیسائی عربی النسل ہیں۔ اور عربی زبان جاننے کو اپنا فخر سمجھتے ہیں

ان لوگوں نے طرز جدید پر ایسی سہل کتابیں تالیف کی ہیں۔ جن کے ذریعہ غیر لوگوں کو عربی زبان کا سیکھنا عموماً سہل ہو گیا ہے۔ تالیفات جدیدہ کی روح ان لوگوں میں انگریزی اور فرانسیسی زبانیں جاننے سے پیدا ہوئی ہے۔ اس صدی کے مشاہیر مصنفین مطابع۔ اخبارات اور انگلیسیہ لسوریہ کی مختصر کیفیت کا اس موقعہ پر لکھنا غالباً ناظرین کی دلچسپی کا باعث ہوگا +

مصنفین۔ جن لوگوں کی تصنیفات ملک اور قوم میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی گئی ہیں۔ ان میں سے احمد آفندی فارس۔ بطرس بستانی۔ ناصیف یازجی۔ ابراہیم احدب۔ چار مصنف بڑے پائے کے گذرے ہیں۔ ان میں سے احمد آفندی فارس اور ابراہیم احدب مسلمان اور بطرس بستانی۔ ناصیف یازجی عیسائی ہیں +

احمد آفندی وہ شخص ہے۔ جس کا عربی اخبار الجوائب ایک زمانہ میں بڑی آب و تاب کے ساتھ استنبول سے روزانہ شائع ہوتا تھا۔ اس کی تصانیف میں سے الجاسوس علی القاموس اور سر اللیال فی القلب والابدال علم لغت میں۔ الساق علی الساق اور کشف المخبا ادب و تاریخ میں۔ غنیۃ الطالب و منیۃ الراغب صرف و نحو میں مشہور کتابیں ہیں۔ احمد آفندی نے ان کتابوں کے علاوہ علمائے عرب کی چند قدیم کتابیں بھی مشتہر کی ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی کتابیں چھاپنے اور فروخت کرنے کا انتظام بھی اس کے متعلق تھا +

بطرس بستانی نے آج سے قریب تیس سال پیشتر ایک کتاب محیط المحیط علم لغت میں تالیف کر کے چھپوائی ہے جس کی ضخامت اڑھائی ہزار صفحہ کے قریب ہوگی۔ یہ کتاب حروف تہجی کی ترتیب پر بہت آسان عبارت میں لکھی گئی ہے۔ جا بجا اشعار اور امثال اور آیات قرآنیہ

سے استشہاد کیا ہے۔ زمانۂ تالیف تک جو الفاظ جدیدہ معلوم ہوئے وہ بھی درج کئے ہیں۔ اس مصنف نے انسائیکلوپیڈیا کے طور پر ایک کتاب دائرۃ المعارف کے نام سے لکھنی شروع کی تھی۔ مگر اس کی زندگی نے مہلت نہ دی۔ اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹے یکے بعد دیگرے اس کام کو کر رہے ہیں۔ اور دس جلد تک کتاب تیار ہو گئی ہے +

ناصیف یازجی کی کتابوں میں سے مجمع البحرین اور شرح دیوان متنبی علم ادب میں بہت مشہور ہیں۔ صرف و نحو معانی بیان و عروض پر اس نے جو متعدد چھوٹے چھوٹے رسالے تالیف کئے ہیں۔ وہ بیروت کے مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں +

ابراہیم احدب نے ضرب الامثال میں ایک ضخیم کتاب سات آٹھ سو صفحوں پر لکھکر چھپوائی ہے۔ اکثر امثال کو نظم کا لباس پہنایا ہے۔ بدیع الزمان ہمدانی کے رسایل کی شرح بھی بہت جامعیت سے لکھی ہے +

چھاپے خانے۔ بیروت میں چھاپے خانے تو کثرت سے ہیں مگر علمی کتابوں کے چھاپنے میں صرف دو مطبعوں نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ مجھے ان دونوں مطبعوں میں جانے اور وہاں کی کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا +

مطبع کاتھولیکی۔ اس مطبع نے عربی زبان کی چند قدیم اور نایاب کتابیں مثل فقہ اللغۃ ثعالبی۔ الفاظ الکتابیہ ہمدانی۔ کنز الحفاظ ابن سکیت۔ نوادر ابی زید کتاب الدارات اصمعی اور نصرانی شعرائے عرب کے بعض قدیم دواوین بڑی محنت سے بہم پہنچا کر مشتہر کئے ہیں۔ علاوہ بریں اپنے صرف سے کتب مفصلہ ذیل تالیف

کرا کر شائع کیں۔ اقرب الموارد (علم لغت میں) ۲ جلد۔ رنات المثالث والمثانی خلاصۂ اغانی۔ کشف المعانی شرح رسائل بدیع الزمان ہمدانی۔ شرح مقامات بدیع الزمان ہمدانی۔ اس مطبع کا سیکرٹری ایک مسیحی عالم لوئس شیخو الیسوعی عربی علم ادب کا بڑا ماہر ہے۔ اس نے متعدد کتابیں خود تالیف کر کے چھپوائی ہیں مجانی الادب ۶ جلدیں۔ شرح مجانی الادب ۳ جلدیں۔ علم الانشا والعروض والخطابہ ۲ جلدیں۔ مقالات علم ادب (متعلق علم الانشا) ۲ جلدیں +

مطبع امریکانی۔ اس مطبع کی خاص توجہ کتب علمیہ مثل حساب جغرافیہ تاریخ۔ منطق۔ ہیئت۔ نباتات۔ جمادات۔ حیوانات اور ڈاکٹری طب کی اشاعت پر ہے۔ یہ کتابیں اکثر فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے ترجمہ ہوئی ہیں۔ اس مطبع کا مربی ڈاکٹر فاندیک تھا۔ جس نے امریکہ سے آکر بیروت میں قیام کیا۔ اور عربی زبان سیکھ کر علوم جدیدہ کے متعلق کتابیں لکھنی شروع کیں ان میں سے ایک سلسلہ آٹھ نمبروں میں ختم کیا ہے۔ جس کا نام نقش فی الحجر ہے۔ اس مصنف نے ایک جغرافیہ المراۃ الوضیہ بھی بہت عمدگی سے لکھا ہے +

اخبارات۔ بیروت اور لبنان سے گیارہ اخبارات اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ جن میں سے ثمرات الفنون اور روضۃ المعارف مسلمانوں کے زیر اہتمام اور باقی نو اخبار اور رسالے مثل لسان الحال البشیر الضیا المشرق وغیرہ عیسائیوں کی زیر نگرانی ہیں۔ ثمرات الفنون کے مالک شیخ عبد القادر قبانی اور اڈیٹر شیخ احمد حسن طبارہ سے کئی مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا +

الکلّیۃ السوریہ۔ یہ ملکِ شام کے عیسائیوں کا کالج ہے۔ اس میں علاوہ علوم و فنون کے عربی انگریزی اور فرنچ زبانیں بھی سکھائی جاتی ہیں۔ اور ہر قسم کے تجربوں کے واسطے آلات و نقشہ جات بہت عمدہ موجود ہیں۔ بورڈنگ ہوس کا انتظام بھی نہایت قابلِ تعریف ہے۔ اس کالج کے پہلے طالب علموں نے ایسی شہرت حاصل کی ہے جیسی ایک زمانہ میں پرانے دہلی کالج کے طلباء کو حاصل تھی۔ مصر کے اخبار المقطم اور المقتطف کے ایڈیٹر یہیں کے تعلیم یافتہ ہیں۔ اس کالج کے ساتھ ایک مدرسہ طبیہ بھی ہے۔ جس کے تعلیم یافتگاں کو ڈپلوما ملتا ہے۔ اور فرانس میں مقبول ہے مجھے ایک ایرانی دوست یوسف آفندی کے ہمراہ کالج کی تمام عمارات دیکھنے اور وہاں کے انگریزی پروفیسروں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس کالج کے ساتھ ایک چھوٹا سا عجائب خانہ اور ایک رصد خانہ بھی ہے +

اس کالج کے مصارفِ تعلیم و خورو نوش بمقابلہ یوروپ نصف کے قریب ہیں اور استنبول کے مقابلہ میں بھی نسبتاً کم ہیں۔ بلادِ شام کے علاوہ مصر اور ایران کے کئی طلباء اس کالج میں پڑھتے ہیں۔ ہندوستانی طلباء کو استنبول میں درس حاصل کرنے سے ترکی اور فرانسیسی زبانوں میں خاص ملکہ ہو سکتا ہے۔ مگر اس جگہ عربی انگریزی اور فرانسیسی حاصل کرنے کا عمدہ موقعہ ہے۔ علاوہ بریں ترکی زبان سیکھنے کے ذرایع بھی مل سکتے ہیں +

دمشق

بیروت سے دمشق تک ۸۴ میل کا فاصلہ ہے۔ جو ریل کے ذریعہ نو گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ اس ریل کو آدھا راستہ لبنان کی پہاڑیوں پر سے عبور کرنا ہوتا ہے۔ جس سے رفتار بہت دھیمی ہو جاتی ہے۔ اور یہی وجہ زیادہ عرصہ لگنے کی ہے۔ یہ ریل ایک فرانسیسی کمپنی کی ملکیت ہے۔ میں صبح کو سوار ہو کر عصر کے قریب دمشق پہنچا۔ اور ایک لوکنڈہ میں قیام کیا

دمشق پہنچنے کے ایک دن بعد میری ملاقات ایک افغانی رئیس زادہ سے ہو گئی۔ ان کا نام سردار محمود بگ ہے۔ ان کے والد سردار غلام محمد خاں طرزی سلطنت عثمانی کے وظیفہ خوار ہیں۔ وہ اس وقت حرمین کی زیارت کو تشریف لے گئے تھے۔ اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ سردار زادہ کی خوش خلقی اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ جب میں دمشق پہنچتے ہی دفعتہً بیمار ہو گیا۔ تو انھوں نے میرے معالجہ میں بہت تکلیف اٹھائی۔ یہانتک کہ میرا اسباب ہوٹل سے اٹھوا کر اپنے مکان پر منگوا لیا۔ اور نہایت اصرار سے ایام اقامت دمشق تک مجھے اپنا مہمان رکھا۔ دمشق کی سیر اور وہاں کے اکابر کی ملاقات خود اپنے ساتھ لیجا کر کراتے رہے ؛

دمشق بہت پرانا شہر ہے۔ اور تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے قبضے میں چلا آتا ہے۔ مدینہ منورہ اور کوفہ کے بعد یہ تیسرا شہر ہے جو بنی اُمیہ کے زمانہ میں اسلامی دار الخلافہ قرار پایا۔ اس وقت یہ شہر بہت ترقی پر تھا۔ مال و دولت

کی افزونی کے باعث ارباب کمال چاروں طرف سے کھنچے چلے آتے تھے۔ لیکن اب زمانہ کے انقلابات سے اس کی حالت میں بہت تغیر واقع ہوگیا ہے۔ اس کی موجودہ آبادی قریباً تین لاکھ ہے چھٹے حصے کے قریب عیسائی اور باقی سب مسلمان ہیں۔ یہ شہر اس وقت ملک شام کا دارالحکومت اور ترکی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ ہز اکسیلنسی جواد پاشا یہاں کے گورنر ہیں جو اس سے پیشتر قسطنطنیہ میں وزیر اعظم بھی رہ چکے ہیں۔ سردار زادہ کے ذریعہ ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت اخلاق سے پیش آئے۔ اور ہندوستان کی مالگزاری کے حالات دریافت کرتے رہے۔ یہ اصل میں عرب ہیں۔ مگر گفتگو ترکی میں کرتے تھے۔ اور سردار زادہ ہم دونوں میں ترجماں تھے +

دمشق کی آب وہوا نہایت خوشگوار ہے۔ اور ہر قسم کے میوہ جات بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ اور سستے بکتے ہیں۔ اس شہر کی سرزمین کو جو غوطہ کے نام سے مشہور ہے۔ انہیں خوبیوں کے باعث عرب کے شعرا نے دنیا کے چار بہترین تفرج گاہوں میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پہلا صغد سمرقند۔ دوسرا ابلہ تیسرا شعب بوان۔ اور چوتھا غوطہ دمشق ہے۔ آب وہوا کی عمدگی نے باشندگان کے حسن وجمال کو وہ رونق اور تازگی بخشی ہے۔ کہ اس ظاہری حسن میں ملک شام کے لوگ مصر اور قسطنطنیہ کے لوگوں سے فوقیت رکھتے ہیں۔ مگر حسن باطنی اپنے حسن خلق و مروت اور شجاعت میں ترکوں سے بہت پیچھے ہیں۔ زمانہ حال کی ترقیات سے بھی بہت کم مستفید ہوئے ہیں۔ قدیم لباس کے ساتھ خیالات قدیمہ کو بدستور سنبھالے بیٹھے ہیں +

یہاں کے بازار بہت وسیع، دورویہ عالیشان پختہ عمارتیں اور اکثر مسقف ہیں۔ ان میں سے سوق حمیدیہ اور سوقِ مدحت پاشا زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے دونوں طرف دو منزلہ دوکانوں کی قطاریں چلی گئی ہیں۔ جن کے اوپر چونہ اور پتھر کی محراب دار عمارتیں ہیں۔ بہیئت مجموعی یہ بازار بہت شاندار معلوم ہوتے ہیں۔ کلکتہ۔ بمبئی۔ قاہرہ اور سکندریہ میں اس قسم کے بازار کہیں دیکھنے میں نہیں آئے۔ قسطنطنیہ میں چارسو حمیدی کی چھتیں بیشک پٹی ہوئی ہیں۔ مگر ان بازاروں کی وسعت اور چھتوں کی بلندی کے مقابلہ میں ہیچ ہیں +

مکانات سکنی کی عمارتیں بالعموم باہر سے کم حیثیت نظر آتی ہیں۔ لیکن اندر جانے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نہایت خوبصورت۔ خوش وضع صاف اور ستھری ہیں۔ یہاں ایک عمارت بیت العظم کے نام سے مشہور ہے۔ قیصر جرمنی جو پچھلے دنوں ملک شام کی سیر کو آئے تھے تو اس کی خوبصورتی اور کاریگری کو دیکھکر حیران رہ گئے۔ ملک کے رواج کے مطابق دمشق میں بھی بہت خوشنما قہوہ خانے موجود ہیں۔ مگر ان میں استنبول کے قہوہ خانوں جیسی نفاست نہیں البتہ حمام بہت نفیس اور استنبول کی طرح بہ تکلف ہیں۔ یہاں کی خانین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اطراف وجوانب کے سوداگر اپنا مال فروخت کرنے کے واسطے یہاں لاتے ہیں۔ گویا یہ دمشق کی تجارتی منڈیاں ہیں بسا بیشتر لوگ ان میں رہتے ہیں۔ مگر یہاں اعلےٰ درجہ کا کوئی ہوٹل میری نظر سے نہیں گذرا +

بازاروں کی وسعت اور مکانوں کی خوبصورتی کے ساتھ آب رسانی

کا جیسا عمدہ انتظام دمشق میں ہے۔ ویسا کہیں کم ہو گا۔ ایک بلند پہاڑی سے سات نہریں کاٹ کر اس انداز سے شہر میں لائی گئی ہیں کہ نلوں کے ذریعہ ان کا پانی تمام گھروں میں دن رات جاری رہتا ہے۔ پانی کی اس کثرت نے دمشق کی زندگی کو ایک خاص قسم کی دلچسپی دے رکھی ہے +

یہ سب کچھ ہے۔ مگر علمی فضل و کمال جو عرصہ دراز تک اس شہر کی شہرت کا باعث رہا۔ وہ اب معدوم ہے جامع اموی میں اگرچہ بہت سے مدرس تعلیم کے واسطے مقرر ہیں۔ جن کو اوقاف سے تنخواہیں ملتی ہیں۔ مگر وہاں صرف و نحو۔ ادب اور فقہ کی تعلیم معمولی طور سے ہوتی ہے۔ ایک کتبخانہ بھی شہر میں موجود ہے جس میں مختلف علوم کی کتابیں فراہم کی گئی ہیں۔ ان میں تاریخ ابن عساکر بھی ہے۔ جس کی ضخیم اسّی جلدیں مشہور ہیں۔ موجودہ علماء کی تصانیف میں سے کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گذری۔ اتنے بڑے شہر میں دو تین مطبع ہیں۔ اور صرف ایک اخبار نکلتا ہے۔ گورنمنٹ ٹرکی کی جانب سے ایک مکتب قائم ہے۔ جس میں اعدادی درجہ تک تعلیم ہوتی ہے +

دمشق کی مسجدیں قدیم اور نہایت ہی عمدہ بنی ہوئی ہیں۔ اور گنتی سو سے زیادہ ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور اور خوبصورت مسجد جامع اموی ہے جو ولید بن عبد الملک نے اپنے عہد خلافت میں تعمیر کرائی تھی۔ اس کا طول ۲۰۰ قدم اور عرض ۱۵۰ قدم ہے۔ ۸۸ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی بارہ ہزار کاریگر اور انجنیر جو ملک روم اور دیگر اطراف و جوانب سے بلائے گئے

تھے کام کرتے رہے۔ ۵۰ لاکھ روپیہ کی لاگت سے آٹھ سال میں بن کر تیار ہوئی +

اس مسجد کی تعمیر کے متعلق مورخ بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ نے اپنی کتاب فتوح البلدان میں یہ عجیب واقعہ لکھا ہے کہ مسجد کے مجوزہ نقشہ میں عیسائیوں کا ایک گرجا بھی آتا تھا جس کا نام کنیسہ یوحنا تھا۔ ولید نے ہر چند چاہا کہ عیسائی معاوضہ لیکر کنیسہ دیدیں مگر انہوں نے نہ مانا۔ ولید نے کہا کہ اگر تم نہ مانو گے تو میں اس کو جبراً گرادوں گا۔ پادریوں نے کہا کہ جو شخص گرجے کو مسمار کرے یا تو وہ دیوانہ ہو جائے گا یا کوئی مصیبت اس کو پیش آئیگی۔ ولید نے اسی وقت کدال منگواکر اپنے ہاتھ سے دیواریں گرانی شروع کیں۔ اور جو ریشمی قبا پہنے ہوئے تھا اس کے گرد آلود ہونے کا کچھ خیال نہ کیا۔ غرض اس طرح سے یہ گرجا مسجد میں شامل کیا گیا۔ مگر پادریوں کے دل میں اس کا خیال کانٹے کیطرح کھٹکتا رہا چنانچہ چند سال بعد جب عمر بن عبد العزیز خلیفہ ہوئے۔ اور ان کے عدل وانصاف نے شہرت حاصل کی تو عیسائیوں نے ان سے استغاثہ کیا۔ اور مسجد سے گرجے کی زمین نکال دینے کا حکم حاصل کر لیا۔ مگر دمشق کے مسلمانوں کو یہ بات بہت ناگوار معلوم ہوئی انہوں نے سلیمان بن حبیب محاربی کے مشورہ سے جو بہت بڑا فاضل اور یگانۂ روزگار تھا عیسائیوں سے یہ کہا کہ یا تو غوطہ کے وہ تمام گرجے جو مسلمانوں نے بزور شمشیر فتح کرنے کے بعد تمہیں دیدیئے تھے واپس کر دو یا اس گرجے کا خیال چھوڑ دو۔ یہ کیفیت سنکر عیسائیوں نے اپنا دعوٰے چھوڑ دیا اور عمر بن عبد العزیز بھی اس تجویز سے خوش ہو گئے +

یہ مسجد دنیا کی خوبصورت اور نامور مسجدوں میں شمار ہوتی تھی۔ مگر چار پانچ سال ہوئے کہ آتشزدگی سے بالکل ویران ہو گئی۔ اہل شام نے پچاس ساٹھ ہزار پونڈ

چندہ فراہم کیا ہے اور بہت عمدگی اور خوبی سے دوبارہ تعمیر ہو رہی ہے میرے ایام قیام دمشق میں نصف سے زیادہ کام ختم ہوگیا تھا +

اس مسجد کے صحن میں ایک اونچا گنبد بنا ہوا ہے جس کی نسبت مشہور ہے کہ اس میں مسلمانوں کی متبرک چیزیں رکھی ہوئی ہیں - اور حضرت عثمان رضہ کے عہد کا قرآن شریف بھی اس میں ہے +

دمشق کو آب و ہوا کی خوبی اور عمارات کی عمدگی کے علاوہ یہ فخر بھی حاصل ہے کہ اس میں بہت سے انبیائے عظام صحابہ کرام اور اکابر اسلام کی قبریں ہیں جن کی ارواح مقدسہ کے فیض سے سرزمین شام مستفیض ہوتی رہتی ہے - شامیوں کے اعتقاد کے مطابق تو ہزاروں نبی یہاں مدفون ہیں - مگر یحییٰ علیہ السلام کے سوا اور کسی کا نام وہ نہیں بتلا سکتے حضرت یحییٰ کی قبر مسجد اموی کے اندر ہے - اور اس پر ایک قبہ بھی بنا ہوا ہے - شہر کے باہر ایک عظیم الشان قبرستان ہے - جس میں صحابہ کی قبریں ہیں اور انہی میں حضرت بلال حبشی حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی بیٹی سیدہ زینب اور حضرت امام حسینؑ کی بیٹی سیدہ سکینہ کے مزارات مقدسہ بھی ہیں - مورخ ابن خلکان اور امام ابن تیمیہ بھی اسی سرزمین میں سو رہے ہیں - صلیبی لڑائیوں کے ہیرو سلطان صلاح الدین ایوبی اور سلطان نور الدین کے مقبرے خاص شہر میں ہیں - قیصر جرمنی پچھلے دنوں جب دمشق میں آئے تو سلطان صلاح الدین کے مقبرہ میں گئے تھے اور ریشم کے ایک پارچہ پر ان کا اور اپنا نام یادگار کے طور پر عربی زبان میں لکھ کر قبر کے سرہانے آویزاں کر آئے تھے - شہر کے ایک حصہ میں جس کا نام صالحیہ

ہے۔ امام الصوفیہ شیخ الطریقت حضرت محی الدین ابن عربی کی قبر ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مسجد بھی بنی ہوئی ہے۔ اسی کے قریب الجزائرہ کے نامور بہادر شیخ عبد القادر جزائری کی قبر ہے۔ جس نے فرانس کو کئی دفعہ شکستیں دی تھیں اس کے علاوہ صحابہ علماء اور فضلا کی بیشمار قبریں ہیں۔ جن کی تفصیل کے واسطے دفتر درکار ہے +

دمشق کے حالات ختم کرنے سے پیشتر مجھے امیر تیمور کا ایک لطیفہ لکھنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو سردار محمود بک نے شامیوں کی زبان سے روایت کیا۔ جس زمانہ میں امیر تیمور فتوحات کرتا ہوا دمشق میں پہنچا تو امرا کے مکانات کو نہایت آراستہ و پیراستہ اور ائمہ دین کے مزارات کو نہایت خستہ حالت میں پایا اس سے اس کو بہت رنج ہوا۔ اور اکابر شام کو مخاطب کر کے کہا کہ میں اپنے ملک میں مورخین سے سنا کرتا تھا کہ شامیوں نے جناب امیر اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی لڑائیوں میں اہل بیت کا ساتھ نہ دیا بلکہ مخالفین کی طرفداری کی۔ مجھے ان دونوں روایتوں کا یقین نہ ہوا۔ کیونکہ ایک پکّے مسلمان کا آل رسول کو چھوڑ کر فریق مخالف کی طرفداری کرنا قرین قیاس نہیں تھا۔ مگر مجھے شام میں آنے سے ان روایتوں کی تصدیق ہو گئی۔ امرا کے گھر ایسے آراستہ و پیراستہ اور صحابہ کی قبریں ایسی خستہ و شکستہ۔ ان دنیا پرستوں نے اُس زمانہ میں بھی حُب دنیاوی اور رجاہ طلبی سے ضرور ایسا ہی کیا ہو گا +

میں ۲۵ دن تک دمشق میں قیام کرنے کے بعد بیروت کو واپس چلا آیا۔ اس عرصہ میں سردار زادہ نے میری جس قدر خاطر مدارات کی تھی میں ان کا تہ

دل سے ممنون ہوں۔ سردار زادہ نہایت علم دوست ہے۔ فارسی اور ترکی نہایت اچھی طرح سے لکھ پڑھ سکتا ہے۔ عربی میں بھی مہارت پیدا کر لی ہے فرصت کے وقت مطالعہ کتب میں مشغول رہتا ہے۔ اور ایک مختصر سا کتب خانہ بھی رکھا ہوا ہے۔ منجملہ کتب جدیدہ کے ایک کتاب قاموس الاعلام مجھے دکھائی جو ترکی میں ۶ جلدوں میں چھپی ہے۔ اور تمام دنیا کے مشہور لوگوں ملکوں اور شہروں کے نئے اور پرانے حالات اس میں درج ہیں +

طرابلس

دمشق سے واپس آنے پر میں چند روز بیروت میں ٹھیرا اور پھر طرابلس کو روانہ ہوا۔ شامی اس کو طرابلس الشام کہتے ہیں۔ تاکہ اس میں اور طرابلس الغرب میں ایک گونہ امتیاز رہے۔ یہ شہر سمندر کے قریب ہے اور جہاز کے ذریعہ ۶ گھنٹے میں اس کی مسافت طے ہوتی ہے۔ اصلی شہر ساحل سے ایک میل کے فاصلہ پر ہے جس کا نام طرابلس ہے۔ اس کی آبادی تیرہ ہزار ہے مابعد کی آبادی بندرگاہ پر ہے۔ اور اس کو اسکلہ کہتے ہیں۔ اس میں چار ہزار آدمی کے قریب رہتے ہیں۔ کل آبادی میں مسلمان زیادہ اور عیسائی صرف ایک چہارم کے قریب ہیں۔ دونوں مقامات میں اسپی ٹرمیوے کے ذریعہ آمد و رفت ہوتی ہے۔ اور مسافروں کے واسطے ہر آبادی میں متعدد ہوٹل موجود ہیں +

اس شہر میں باغات بکثرت اور میوہ جات لذیذ ہوتے ہیں - مگر شام کے مقابلہ میں کم - آب وہوا علی العموم اچھی ہے - لیکن پانی اور درختوں کی کثرت سے کبھی کبھی بخار کی شکایت ہو جاتی ہے - باشندوں کا میلان قدیم زمانہ سے عربی زبان اور عربی علوم کی طرف ہے اور علما اس کو اب تک نباہے جاتے ہیں - علمار میں سے ایک شخص محمد حسین جسر بڑے رتبہ کے عالم ہیں اور انھوں نے جدید علم کلام پر ایک کتاب حمیدیہ نام لکھی ہے اس کا ترجمہ سائنس اور اسلام کے نام سے ہندوستان میں چھپ چکا ہے - یہاں سے ایک عربی اخبار بھی شائع ہوتا ہے جس کے مالک و ایڈیٹر محمد علی بحیری ہیں مجھے مصنف رسالہ حمیدیہ - و اڈیٹر اخبار - اور شہر کے متعرف (کمشنر) اور چند دیگر اہل علم سے ملنے کا اتفاق ہوا - طرابلس کے باشندے علمی قابلیت حسن اخلاق اور شجاعت میں دمشقیوں سے فائق ہیں +

میں ایک ہفتہ یہاں رہ کر بیروت کو واپس چلا آیا +

عکّا

مجھے طرابلس سے بیروت آئے ہوئے ابھی چند روز گزرے تھے کہ سفر عکّے کا خیال دامنگیر ہوا - اس شہر کو بالفعل جو خصوصیت فرقہ بابیہ کے پیرو مرشد کے ورود و قیام کی وجہ سے حاصل ہے وہ میرے اس سفر کا باعث تھی - تیرھویں صدی ہجری کے وسط میں فرقہ بابیہ کا ظہور ملک ایران میں ہوا اور تھوڑے عرصہ میں اُٹھا ایک ایسا مذہبی انقلاب پیدا کیا کہ شاہ ایران کو

اس فرقہ کی روک تھام پہ خاص توجہ کرنی پڑی - بہت سی خونریزی کے بعد اس کا خاتمہ بادی مذہب کے وطن سے نکالے جانے اور عکے میں قیام کرنے پر ہوا - میرے دوست فواد بک سلیم مصری کی تحریک تو پہلے ہی سے اس سفر کی نسبت تھی مگر سردست حاجی محمد مصطفٰے آفندی بغدادی جو بیروت کے مشہور تاجر اور فرقہ بابیہ کے نامور رکن ہیں ان کے حسن اخلاق اور علمی معلومات نے اس تحریک کو اور زیادہ کر دیا - اور میں شروع دسمبر میں عکے کو روانہ ہوا +

ہمارا جہاز ۱۲ گھنٹے کے عرصہ میں حیفا پہنچا جو عکے سے پانچ چھ میل کے فاصلہ پہ اور اس کا بندرگاہ ہے - اگرچہ عکا خود بھی ساحل بحر پہ واقعہ ہے مگر کچھ عرصہ سے ترکی گورنمنٹ نے بعض پولٹیکل وجوہات کی بنا پر یہ انتظام کر رکھا ہے کہ جو جہاز اطراف و جوانب سے عکے کو آئیں وہ حیفا کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوں - میں جہاز سے اتر کر کنارہ کے قریب پہنچا - تو ایک ایرانی کو دیکھا کہ مسافروں کی طرف اس حیثیت سے نظر دوڑا رہا ہے جیسا کوئی کسی کا متلاشی ہوتا ہے - معلوم ہوا کہ یہ شخص حاجی صاحب کا تار موصول ہونے پر میرے لینے کو آیا ہے میں نے رات اس کے ہاں بسر کی اور صبح اس کے ہمراہ عکے کو روانہ ہوا - سمندر کے کنارہ کنارہ ایک کچی سڑک بنی ہوئی ہے - اور تانگے دن بھر آمد و رفت کرتے رہتے ہیں +

میں اور میرا ہمراہ دو گھنٹے کے عرصہ میں عکا پہنچے - اور سیدھے عباس آفندی کے مکان پہ گئے جو اس وقت فرقہ بابیہ کے پیر و مرشد ہیں - انہوں

نے میرے آنے کی خبر سن کر سید جواد آفندی تاجر ایرانی کو انتظام مہمانداری کیواسطے کہلا بھیجا تھا چنانچہ میں ان کے ہاں ٹھہرایا گیا - یہ بھی معلوم ہوا کہ جو لوگ عباس آفندی کی ملاقات کو آتے ہیں ان میں سے بعض لوگ ان کے لنگر سے کھانا کھاتے ہیں بعض کو مریدوں کے ہاں خصوصیت سے ٹھہرایا جاتا ہے - یوروپین اور فرنگی منش لوگوں کے رہنے کا انتظام ہوٹل میں ہوتا ہے - عکّہ ایک چھوٹا سا شہر ہے - اسکی آبادی قریباً چھ ہزار ہو گی - تاریخی حیثیت سے اس کو کئی خصوصیتیں حاصل ہیں اسلام سے بہت پہلے کا آباد ہے - مسلمانوں اور یوروپین قوموں کا اکثر میدان کارزار رہا ہے - اس وقت ٹرکی گورنمنٹ کے جلاوطن مجرم یہاں بھیجے جاتے ہیں +

چار بجے کے قریب عباس آفندی سید جواد کے مکان پر تشریف لائے اور اپنی ملاقات سے مجھکو مسرور کیا - چونکہ پہلی ملاقات تھی اس واسطے مزاج پرسی اور سفر کے مختصر حالات گے سوا کسی لمبی چوڑی تقریر کا اتفاق نہ ہوا - آفندی صاحب کی عمر پچاس سال کے قریب ہو گی - لباس سادہ نشست و برخاست بے تکلف اور طبیعت میں بہت انکسار ہے - اس کے دوسرے دن میں عباس آفندی کے مکان پر گیا - اور دیر تک گفتگو ہوتی رہی - اتنے میں سید جواد کا خدمتگار آیا - اور کھانا تیار ہونے کی خبر دی - آفندی صاحب نے جن عمدہ الفاظ میں کھانے پر جانے کے واسطے مجھے توجہ دلائی - وہ یہ تھے "نہار* انتظار شما میکند" شام کو سید جواد شہر اور بیرون شہر کی سیر کیواسطے مجھے لے گئے - بابیوں کا قبرستان دکھلایا ہر قبر پر مردہ کا نام اور تاریخ وفات کندہ تھی - پھر عباس آفندی کا باغ دکھلایا -

* ایرانیوں کی اصطلاح میں دوپہر کے کھانے کو نہار کہتے ہیں +

اتنے میں عباس آفندی بھی تشریف لے آئے اور شام کو ہم لوگ واپس آئے۔ تیسرے دن سید جواد کے ہمراہ جمعہ کی نماز مسجد میں پڑھی باوجودیکہ قصبہ چھوٹا ہے مگر نمازیوں کا بڑا ہجوم تھا۔ چوتھے دن پھر میری ملاقات عباس آفندی سے ہوئی۔ اثنائے گفتگو میں فرمایا کہ عکہ آپ کو پسند آیا۔ مینے کہا کہ میرا یہ سفر عکہ دیکھنے کی غرض سے نہیں تھا بلکہ آپکی ملاقات حاصل کرنے کی غرض سے تھا۔ ان ملاقاتوں میں مفصل تقریر کرنے سے معلوم ہوا کہ عباس آفندی کے مذہبی وتاریخی معلومات بہت اعلےٰ درجہ کے ہیں۔ مسلمانوں کے سوا اکثر فرقوں کے عقاید سے انکو نہایت عمدہ واقفیت ہے۔ فارسی تو ان کی مادری زبان ہے مگر عربی اور ترکی زبانیں بھی اس خوبی سے جانتے ہیں کہ اہل زبان کے ہم پلہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد مینے ان سے روانگی کی اجازت لی اور حیفا کو واپس چلا آیا +

ایام اقامت عکہ میں میرے میزبان سید جواد آفندی نہایت خوش خلقی سے برتاؤ کرتے رہے اور تواضع وتکریم کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ان کے علاوہ عباس آفندی کے دو تین قریبی رشتہ داروں اور مریدوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ باشندگان شہر سے بھی اس فرقہ کے برتاؤ کی نسبت دریافت کرنے کا موقعہ ملا۔ عباس آفندی اور ان کے مرید اپنی دینداری اور بالخصوص ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ بیغرضانہ ہمدردی کرنے سے بہت ہردلعزیز اور باشندوں کی نظروں میں بڑے باوقار ہیں۔ اب بیشتر اس کے کہ عکہ کے حالات ختم کروں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقہ کے ظہور اور عقاید کے حالات درج سفرنامہ کئے جائیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو کہ اس فرقہ کے عقاید

میں کیا جدت ہے کہ اس نے باوجود جلاوطنی۔ مخالفت حکام اور تخالف مذہب تھوڑے عرصہ میں ایران سے نکلکر استنبول۔ شام۔ مصر امریکہ۔ بمبئی اور رنگون تک مسلمانوں اور عیسائیوں کی نظروں میں اعتبار پیدا کر لیا

فرقہ بابیہ کی مختصر تاریخ اور باب کی نسبت معتقدین کے خیالات

یہ فرقہ مرزا علی محمد باب کی طرف منسوب ہے جو سید محمد رضا تاجر شیرازی کا بیٹا تھا۔ اسنے ۱۲۶۰ھ میں پچیس سال کی عمر میں بابیت یعنی باب النجات ہونے کا دعوے شیراز میں کیا اور کچھ لوگ اس کے پیرو ہو گئے۔ یہ ان کے ساتھ بیت اللہ کی زیارت کو گیا۔ جب شیراز میں واپس آیا تو حاکم وقت نے ان کے فتنہ و فساد کی آگ بھڑکتی دیکھکر اس کو شہر بدر کرایا۔ باب اصفہان کو چلا گیا۔ مگر کچھ دنوں کے بعد وہاں بھی یہی معاملہ پیش آیا اور فوجی حراست میں آذربائجان بھیجا گیا۔ یہ وہاں بھی نچلا نہ بیٹھا۔ اور آخر قلعہ ماکو اور چہریق میں نہایت سخت قید میں ڈالا گیا۔ اگرچہ اس وقت لوگوں کو باب کے پاس آمد و رفت کرنے کی سخت بندش تھی۔ مگر معتقدین کی جماعت دن بدن بڑھتی جاتی تھی۔ آخر کار نیریز۔ زنجان اور مازندران میں مسلمانوں نے بابیوں کے مقابلہ کو جہاد قرار دیکر بہت خونریزی کی۔ مگر جب اس سے کچھ فائدہ مترتب نہ ہوا تو ارکان سلطنت نے قتل کرنے کی تجویز کی۔ اور علما کے فتوے سے اس کو اور اس کے مرید آقا محمد علی کو اٹھا کر کے سولی پر چڑھایا۔ اس وقت ہزاروں مخلوقات مکانوں اور چھتوں پر جمع تھی۔ اور فوج نے چاروں طرف سے ان پر گولیاں چلائیں۔ جب گولیوں کا دھواں زائل ہو گیا تو لوگوں نے باب اور

اس کے مرید کو صحیح وسالم پایا دوسرے سر وار پھر فوج نے ان پر گولیاں سر کر کے دونوں کا کام تمام کیا یہ واقعہ ۱۲۶۶ھ میں ظہور پذیر ہوا +

باب کے مریدوں میں اگرچہ ملا حسین بشرویہ اور ملا محمد علی زنجانی بڑے رتبہ کے فاضل تھے مگر ایک عورت زرین تاج جو قرۃ العین کے نام سے مشہور اور ملا صالح قزوینی کی بیٹی تھی۔ علمی فضل وکمال کے علاوہ بڑی خوش بیان اور شاعرہ بھی تھی۔ چنانچہ اس کی جودت طبع کا اندازہ غزل مندرجہ ذیل سے بخوبی ہوسکتا ہے +

گر بتو افتدم نظر دیدہ بدیدہ روبرو — شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو
از پئے دیدن رخت ہمچو صبا فتادہ ام — خانہ بخانہ در بدر کوچہ بہ کوچہ کو بکو
دور دہان تنگ تو عارض عنبرین خطت — غنچہ بغنچہ گل بگل لالہ بلالہ بو بہ بو +
مہر ترا دل حزیں بافتہ بر قماش جاں — بخیہ بہ بخیہ نخ بہ نخ رشتہ بہ رشتہ پو بہ پو
میرود از فراق تو خون دل از دو دیدہ ام — دجلہ بدجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو
در دل خویش طاہرہ گشت و ندید جز وفا — صفحہ بصفحہ لا بہ لا پردہ بہ پردہ تو بہ تو

باب کے بعد اس کا جانشین بہاء اللہ ہوا جو اس وقت طہران میں تھا باب نے قتل ہونے سے پیشتر اپنی تحریریں اور امانتیں بہاء اللہ کے پاس خاص قاصد کے ذریعہ بھیجدی تھیں اس سے ارکان سلطنت نے خیال کیا کہ اس فرقہ کا سرپرست اب بہاء اللہ ہے۔ اس وجہ سے اس کو بغداد کی طرف جلاوطن کر دیا۔ یہ بارہ برس تک بغداد میں رہے۔ انہوں نے ۱۲۷۹ھ میں جو باب کا مقرر کیا ہوا وقت تھا رجعت روح اور لقاء اللہ کا دعوےٰ قرآن مجید کے استشہاد پر کیا۔ بہت لوگوں نے

اس دعوے کو قبول کیا مگر ان کے بھائی ازل نے نہ مانا اور چند بابی بھی اس سے متفق ہو گئے۔ سلطنت ٹرکی نے بہاء اللہ اور اس کے رفقار کو قید کر کے عکہ میں اور ازل کو جزیرہ قبرس میں بھیجدیا۔ بہاء اللہ نے ۱۲۸۸ھ میں بادشاہوں کے نام تلقین مذہب کے خطوط بھیجے اور ایک کتاب دینی احکام میں لکھی جس کو وُہ منزّل من اللہ سمجھتے تھے۔ کچھ مدت بعد بابیوں کے رویہ سے جب ترکی و ایرانی سلطنت کو یقین ہو گیا کہ یہ صرف ایک مذہبی فرقہ ہے اور اس کو پولٹیکل کاموں سے کچھ تعلق نہیں تو بہاء اللہ کو قید سے آزاد کر دیا۔ آخر ۱۳۰۹ھ میں اسی جگہ ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے وفات سے پیشتر ایک وصیت نامہ کے ذریعہ اپنے بڑے بیٹے عباس آفندی کو ارادۃ اللہ اور بابیوں کا مرجع قرار دیا یہ دین بہائی کے مروج ہیں اور اپنے آپ کو عبد البہا کہتے ہیں +

فرقہ بابیہ کے عقائد

یہ عقاید بابیوں کے ایک مشری فاضل حکیم مرزا محمود ایرانی کے قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ اور ان بیانات کے مطابق ہیں جو مجھے ایام اقامتِ عکہ میں دریافت ہوئے تھے میں ان عقاید کو بغیر کسی تغیر و تبدیل اور اظہار رائے کے ذیل میں درج کرتا ہوں:-

اطاعت ملوک را بر اہل مملکت شاں واجب دانند۔ و جہاد و دفاع را ممنوع و منہی گویند و منصوص خوانند۔ رؤسائے ملیہ شاں در غیر منصوصات بمشورت و غلبہ آرا حکم نمایند۔ و ہیچ یک از افراد اہنا رائے مصاب ندارند ربا و سود را باعتدال جایز دانند۔ و در صوم و صلوۃ و خمس و زکوۃ بتغییر فروعات قائلند۔ و گرفتن عیال از ہر طائفہ جائز دانند۔ و ہم چنیں در جزئیات احکام

امادر اصول وکلیات از قبیل مبدء ومعاد وصدق وصفا ودیانت وامانت و
عفت وتقی وامثال آنہا بہ تغیرات معتقد نیستند ودر تہذیب اخلاق وتعدیل
اطوار ساعی - باب را مہدی موعود دانند ومبشر بہاء اللہ - وبہاء اللہ را
مرجع این ظہور وموسس این اساس - وگویند تا ہزار سال دیگر کسے از جانب
خدا نیاید واگر شخصے مدعی شود قبل از ہزار سال کاذب وباطل باشد - آنچہ
در کتاب بہاء اللہ منصوص ست تا ہزار سال تغیر وتبدل نیاید - ورؤسائے
این طائفہ نیز در احکام منصوصہ مطیعند ودر غیر منصوصات بملاحظہ وقت و
زمان حکم وعمل نمایند - ہر کس مومن بہ بہاء اللہ نباشد او را اہل نجات ندانند
ولے معارضہ وتعرض باو باطل دانند - وفقط او را بملائمت وعظ ونصیحت نمایند
بتعدد عوالم الہیہ قائلند وبہ بقائے ارواح وبے مانندی خداوند وجزائے
ہر نادان ودانشمند معتقدند - وگویند کیفیت عالم بعد چنانکہ ہست در ادراک
عالم قبل در نمے آید - وادنے احاطہ در اعلے ندارد - درویشی وبے ہنری را
مذموم شمرند - وریاضت شاقہ را بیہودہ بینند ودر ہر فردے از افراد کسب
وشغل وصنعتے لازم دانند واز عبادات شمارند - ودر الحال مامور بعبادت
واذکار پروردگار اند - در مشرق الاذکار بعد از حقیت انبیاء وکتب انہا ومن
عند اللہ بودن قرآن کلمات بہاء اللہ را وحی وجامع لوازم وتکالیف
عصریہ دانند ❖

حیفا

عکے سے واپس آنے پر مجھے بیت المقدس کی زیارت کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس وقت کوئی جہاز جانے والا نہ تھا۔ اس لئے جہاز کے انتظار میں کئی دن حیفے میں ٹھہرنا پڑا +

حیفا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پیشتر اس کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ مگر تجارتی تعلقات سے تھوڑے دنوں میں اس کی حالت کچھ سے کچھ ہو گئی ہے۔ یوروپ کے سوداگروں خصوصاً جرمنی کے باشندوں کی متعدد دکانیں اس شہر میں بہت بارونق ہیں۔ یہ دکانیں اُس نو آبادی کی ترقی کے باعث قائم ہوئی ہیں جو باشندگان جرمنی نے آج سے پچیس برس پیشتر حیفا کے قریب یوروپ کے طریق پر آباد کی ہے یہ لوگ سب کے سب زراعت پیشہ ہیں اور انگور کی کاشت پر ان کی خاص توجہ مبذول ہے اس آبادی کی مردم شماری دو ہزار کے قریب ہوگی +

حیفے کی بندرگاہ کچھ ایسے مناسب موقعہ پر ہے کہ یوروپ کے تجارتی جہاز اس جگہ لنگر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ یورپ کا مال اندرون ملک میں اور ملک کی پیداوار یوروپ کو جاتی رہتی ہے۔ یوروپ و امریکہ کے سیاح جو ہر سال پیلسٹائن (فلسطین) کے مقامات مقدسہ کی زیارت اور آثار قدیمہ کی سیر کو آتے ہیں ان کی گذرگاہ بھی یہی بندر ہے۔ عکا ناصرہ طبریہ اور دیگر شہروں میں یوروپین رعایا آباد ہونے کے باعث دُول

اجنبیہ کے متعدد قونصل حیفا میں رہتے ہیں جو اپنی اپنی رعایا کی مصلحتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ غرض تجارتی تعلقات اور سیاسی وجوہات سے حیفا کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے ؛

تین چار دن کے بعد یافا بیت المقدس کا بندرگاہ کیطرف جانیوالا ایک جہاز آیا۔ اور میں ٹکٹ لیکر اسپر سوار بھی ہوگیا۔ مگر سمندر میں بڑا تلاطم تھا جہاز ۲۴ گھنٹے اپنی جگہ سے نہ ہلا اور آخر کار یافا کے مسافروں کو وہیں چھوڑ کر سیدھا پورٹ سعید کو چلا گیا اس کے دو دن بعد میں بیروت کے جہاز پر سوار ہو کر بیروت کو چلا آیا ؛

سفر سے میری واپسی کے وجوہات

مجھے بیروت میں رہتے ہوئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اور میں اس عرصہ میں بیروت ۔ دمشق طرابلس عکا اور حیفا کی سیر کر رہا تھا کہ دفعتہ میرے قبلہ و کعبہ جناب مولوی حافظ عمر الدین صاحب کے انتقال کی خبر پہنچی۔ اور اسی ڈاک میں اخبار وکیل مورخہ ۲۴ ۔ دسمبر ۱۸۹۹ء وصول ہوا جس میں اس دردناک واقعہ کی نسبت حسب ذیل درج تھا۔

افسوس ہے کہ جناب حافظ حاجی عمر الدین صاحب سابق مفتی ضلع ہوشیارپور

وامام جامع مسجد دھرم سالہ بعارضہ فالج اسّی برس کی عمر میں یکم دسمبر
اور ۳۰ نومبر کی درمیانی رات کو واصل برحمت الٰہی ہو گئے انا للہ وانا الیہ راجعون
مرحوم علوم دینی کے بلا مبالغہ بحر بیکران ہی نہ تھے۔ بلکہ اوصاف باطنی وظاہری
کے لحاظ سے فی الحقیقت قطب زمان بھی تھے۔ ۱۸۹۹ء کی آخری ششماہی اور
کسی لحاظ سے ابناء دنیا کے لئے منحوس ثابت ہوئی ہو یا نہ۔ مسلمانوں کے لئے
جن کے باکمال بزرگوار یکے بعد دیگرے اس سرعت سے ان سے ہمیشہ کے
لئے جدا ہو رہے ہیں بیشک نہایت نحس ثابت ہوئی ہے۔ اس زمانہ میں
اگر کوئی عالم بے طمع ہو تو اس کی ولایت میں کوئی شک نہیں۔ مگر مرحوم بے طمع
ہی نہ تھے بلکہ فیاض اور سخی بھی بدرجۂ کمال تھے۔ کئی بیوہ عورتوں اور مسکینوں
کے لئے ماہوار رقمیں مقرر کر رکھی تھیں۔ اور فی زماننا غالباً یہ پہلے عالی ہمت
بزرگوار تھے جنھوں نے ہزاروں روپیہ کی بیش قیمت اور نادر کتابیں مختلف
دینی مدارس اور مساجد کو وقف کر دیں۔ خود ہمیشہ غربت میں رہے اور غریبوں
کی صحبت اور خدمت کو پسند کیا۔ مہمان نوازی بھی ایک خاص وصف اس
بلند مرتبت بزرگوار کا تھا پنجاب کے بہت کم عالم و بزرگوار ہونگے جو اس
فرشتہ خصال مغفور کے نام سے ناواقف ہوں۔ ہمارے ناظرین کے حصہ کثیر
کے لئے ان کی نسبت یہی بتا دینا کافی ہو گا کہ مرحوم سیاح مصر و شام و روم
حافظ عبد الرحمن صاحب کے والد ماجد تھے۔ حافظ صاحب ان کے اکلوتے
بیٹے ہیں۔ اور ان کو مرنے سے ایک دفعہ پہلے دیکھنے کی مرحوم کو ازحد تمنا رہی
جسے افسوس ظالم موت نے پورا ہونے دیا۔ چنانچہ جب مرحوم کو بھی اپنی موت

کے قریب پہنچ جانے کا یقین ہو گیا تو حافظ صاحب کی نسبت ارشاد فرمایا کہ ان کو میری طرف سے دعا و برکت پہنچا دی جائے کہ میں اس سے سب طرح خوش جاتا ہوں۔ خداوند کریم اس کے اور میرے گناہوں کو بخشے۔ وفات سے تقریباً ۲۴ گھنٹے پیشتر تک مرحوم برابر قرآن شریف کا ورد کرتے رہے۔ جب آخری بیہوشی طاری ہوئی تو اس وقت سورہ یٰسین و رعد کو ختم ہی کیا تھا۔ مرتے دم تک بعالم بیہوشی بھی قلب برابر جاری رہا۔ اور ذات واجب الوجود کے پاک نام کے سوا اور کوئی آواز ان کے قلب و ذہن سے سنائی نہ دی۔ حافظ صاحب کو بعالم غربت اس صدمہ عظیم اور خاصکر آخری وقت اپنے بزرگ باپ کی خدمت سے غیر حاضر ہونے سے بیشک سخت رنج پہنچیگا مگر سوائے صبر و شکر کے اور کوئی چارہ نہیں۔ خداوند کریم مرحوم کو غریق رحمت کرے اور حافظ صاحب کو صبر جمیل عطا فرماوے ÷

اس حادثہ جانکاہ نے میری سیر و سیاحت کی تمام خوشی خاک میں ملا دی۔ اگرچہ میں بلاد اسلامیہ میں ابھی کچھ مدت اور رہنا چاہتا تھا۔ مگر اس صدمہ اور خانگی تعلّقات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں فوراً اپنا اسباب لینے کے لئے مصر کو لوٹا۔ اور وہاں سے ہندوستان کو روانہ ہؤا۔ اور ۲۶ فروری ۱۹۰۰ء کو بخیر و عافیت اس مبارک سفر سے اپنے شہر امرتسر میں پہنچ گیا۔ اور جناب والد مرحوم کی قبر کی زیارت سے تسکین قلبی حاصل کی و الحمد للہ علی کل حال

میری اپنی سرگذشت

سرگذشتِ بلاکشاں سُنئے کچھ تو میری بھی داستاں سنئے

میرا سفر ختم ہو گیا اب میں چاہتا ہوں کہ کچھ اپنی سرگذشت بھی بیان کروں تاکہ میرے ہموطنوں کو معلوم ہو کہ مصر - استنبول - اور شام کے سفر میں جو پورے دوسال کا تھا میری گذر اوقات کی کیا صورت تھی +

میں اس مبارک سفر کے واسطے جتنا روپیہ گھر سے لیکر چلا وہ اندازاً بیس روپے ماہوار کے حساب سے تھا لیکن قاہرہ کی طرز معاشرت اور لوگوں کے میل ملاپ کا طریقہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ متوسط درجہ کے مصارف کی کفالت پچاس ساٹھ روپے ماہوار سے کم میں کسی طرح نہیں ہو سکتی - یہ حالت دیکھ کر مینے قاہرہ کے ہندوستانی تاجروں سے مشورہ لیا - اور آخر یہ قرار پایا کہ میں ہندوستان سے تجارتی مال منگوا کر اس کے نفع سے اپنا گذارہ کروں +

میں نے تجارتی مال میں سے کمیاب قلمی کتابوں کی تجارت پسند کی جو میرے مذاق کا کام تھا - امرتسر - قادیاں - لاہور - کانپور - بھوپال - اور بمبئی میں میرے اور جناب والد مرحوم کے جو احباب قلمی کتابوں کے قدردان تھے انہیں خطوط لکھنے شروع کئے - سب سے پہلے مولوی حکیم نورالدین صاحب سابق طبیب خاص ریاست جموں و کشمیر نے قادیان سے کتابیں - سید بہادر شاہ صاحب سوداگر عجائبات روزگار قدیمہ نے لاہور سے آیات قرآنی اور ادعیہ کے کندہ کئے ہوئے نگینے میرے پاس بھیجے - یہ سب چیزیں مناسب قیمت پر فروخت کی گئیں - ان کا روپیہ

پہنچنے سے مالکوں کی تسلی ہوئی اور تجارتی چیزوں کے منگوانے میں میرا حوصلہ بڑھا۔ پھر تو کئی مقامات سے قلمی اور مطلا باتصویر کتابیں اور دوسری قسم کی عجائب چیزیں یکے بعد دیگرے آنی شروع ہوگئیں۔ میں ان اشیاء کے علاوہ مشک۔ عنبر۔ ہلاس (نسوار)، سرمہ بھی بعض لوگوں کی فرمایش سے منگا لیا کرتا تھا۔ ان چیزوں کی روانگی میں حکیم منشی بدرالدین صاحب خاص توجہ مبذول فرماتے تھے۔ غرض یہ کام میرے واسطے بہت مفید ثابت ہوا اور روز بروز میری حالت درست ہونے لگی +

جب مجھے کھانے پینے کی طرف سے اطمینان ہوا تو میں نے اپنی توجہ عربی زبان کی تحصیل و تکمیل پر صرف کی جو میرے اس سفر کا ایک خاص اور اہم مقصد تھا۔ ابتداءً قاہرہ کی مروجہ عربی زبان نہ سمجھنے سے مجھے بڑی دقت ہوتی تھی۔ کیونکہ اصلی عربی زبان مرور زمانہ اور مختلف قوموں کے میل ملاپ سے ایسی بعید الفہم ہو گئی ہے جس کا سمجھنا نووارد عربی خوان کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔ اور یہ زبان قاہرہ میں ایسی عام ہے کہ سب لوگ جاہل سے لے کر عالم تک اسی زبان میں گفتگو کرتے ہیں مگر خوش قسمتی سے جناب مرزا محمد ابوالفضل صاحب ایرانی کی ملاقات نے جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں کے اُستاد ہیں میری اس تکلیف کو کم کر دیا۔ مرزا صاحب شرفاء ایران میں سے ہیں اور جُرفاذقان کے رہنے والے ہیں جو نواح اصفہان میں ایک مشہور جگہ ہے۔ مرزا صاحب موصوف عربی علم ادب۔ معقولات۔ مناظرات مذہبی۔ اور فن تاریخ میں اعلےٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں۔ عشق آباد۔ بلخ۔ بخارا۔ استنبول اور بلاد شام کی سیاحت کر چکے

ہیں۔ شام اور دیگر بلاد اسلامیہ کے ازہری طالب علم مسائل جدیدہ اور مباحث فلسفیہ کی تحقیقات کے لئے اکثر آپ کے پاس آتے رہتے ہیں +

مینے اس عرصہ میں جامع ازہر کی آمدورفت جاری رکھی اور خارج وقت میں دار العلوم کے اُستادوں سے پڑھنا شروع کیا۔ اُنہوں نے مجھے قصاید حفظ کرائے۔ نثر کی قدیم کتابیں پڑھائیں۔ انشا پردازی سکھلائی۔ بعض صاحب مسافر نوازی کی وجہ سے مفت پڑھاتے تھے اور بعض کو نقد معاوضہ دیا جاتا تھا +

جناب مرزا صاحب کی مہربانیاں صرف میری تحصیل علم ہی تک محدود نہیں تھیں۔ بلکہ میری ترقی تجارت کی بھی مددگار تھیں۔ چنانچہ اُن کے ذریعہ ہز اکسیلنسی لطیف سلیم پاشا حجازی سے ملاقات ہوگئی جو ترکی خاندان کے معزز رکن اور اس وقت اپنی قابلیت خداداد اور حسن خدمات سے محکمہ مختلط کے پریزیڈنٹ ہیں۔ بلاد یورپ کی سیاحت بھی کر چکے ہیں اور بڑے راست باز اور خوش معاملہ آدمی ہیں۔ اُن کو قدیم کتابوں اور نوادرات کے خریدنے کا بہت شوق ہے۔ اس ذریعے سے ہر ہفتہ اُن کی خدمت میں نیاز حاصل ہوجاتا تھا۔ اور جو مال ہندوستان سے آتا پہلے اُن کی خدمت میں پیش کیا جاتا۔ مصر کے اکثر عماید اور اہل قلم اُن کے ہاں روزانہ آتے رہتے ہیں آپ ان سب سے نہایت اچھے الفاظ میں میرا تعارف کراتے تھے۔ چند روز میں بہت سے اعلےٰ عہدہ داروں سے اُن کے ہاں شناسائی ہوگئی۔ مصر کی اقامت اور یہاں کے اکابر کے میل ملاپ سے مجھے علمی اور مالی دونوں قسم کے فائدے حاصل ہوتے رہے۔ اور میں تجارت کے ساتھ ساتھ تحصیل علم میں بھی کوشش کرتا رہا۔ اور روپیہ فراہم ہونے سے

استنبول اور شام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا۔ میں متواتر چھ ماہ تک استنبول میں رہا۔ لیکن میری مالی حالت وہاں اچھی نہ تھی کیونکہ ترکوں کو عربی کتابوں کے خریدنے پر بہت کم توجہ ہے۔ اور اجنبیت زبان کے باعث میں امراء سے بے تکلف ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ ترکی ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ اسواسطے ایک ترجمان کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ البتہ میری علمی حالت میں خوب ترقی ہوئی۔ مصر۔ شام۔ عرب۔ عراق کے اکثر لوگ جو تحصیل علم اور نوکری کی تلاش اور وظایف اور تمغائے شاہی کے حاصل کرنے کی غرض سے استنبول میں رہتے ہیں اُن سے رات دن ملاقات کا سلسلہ برابر جاری رہتا تھا خصوصاً سید عبدالحمید آفندی زہراوی زادہ حمصی کی ملاقات نے جو اخبار المعلومات کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ہیں بہت فائدہ پہنچایا اور مینے عربی میں مضامین لکھنے شروع کئے۔ اور عربی خوان جماعت میں ان مضامین کا خوب چرچا ہوا۔

استنبول میں مالی حالت کے ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے مینے جلد روانگی بیروت کا ارادہ کر لیا۔ بیروت اور شام میں عربی زبان ہونے کے باعث وہاں کے امراء اور علماء سے میری بے تکلف ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مگر یہاں سب چیزیں ارزاں ہیں۔ خصوصاً بڑی بڑی قیمتی کتابیں بہت سستی بکتی ہیں۔ پھر میری گراں کتابیں کون خریدتا۔

میں اسی سیاحت کے دوران میں جو خطوط اخبار وکیل امرتسر اور مشیر آصفی مدراس کے ذریعے سے مشتہر کرتا رہا اُن سے ہندوستان کے علم دوست اصحاب

کو مصر اور استنبول کے علمی اور تجارتی حالات دریافت کرنے اور مصر کی کتابیں خریدنے کا شوق پیدا ہوا چنانچہ مصر پہنچنے کے چند ہفتے بعد پنجاب۔ ممالک مغربی۔ بنگال۔ بمبئی۔ مدراس اور حیدرآباد دکن غرض ہندوستان کے اطراف وجوانب سے بیسیوں خطوط پہنچنے لگے ایک یہ ذریعہ بھی میری آمدنی کا تھا +

ان بزرگوں میں دو شخصوں کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے +

(۱) خلیفہ عماد الدین صاحب ڈسٹرکٹ انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور جنہوں نے میری کتاب الصرف اور کتاب النحو اپنی لاگت سے چھپوا کر فروخت کی اور ان کے منافع کا دو سو روپیہ استنبول میں میرے پاس ارسال کیا +

(۲) منشی عزیز احمد صاحب لکھنوی مقیم گلاسگو نے میری علمی تحصیل کا حال اخباروں میں پڑھکر عربی کی دو تین عمدہ کتابیں ولایت کی چھپی ہوئیں مجھے ہدیۃً بھیجیں۔ اور اخبار وکیل میں مضامین لکھکر ہندوستانی مسلمانوں کو میری درمی امداد پر توجہ دلائی یہ مضامین مارچ ۱۸۹۹ء کے پرچوں میں شایع ہوئے تھے اور شاید اُن کا سلسلہ کچھ عرصہ تک جاری رہتا مگر میرے والد بزرگوار نے ان مضامین کی اشاعت کو ناپسند فرمایا اور جناب شیخ غلام محمد صاحب مالک اخبار کو بلحاظ روابط قدیم گھر پر بلوایا اور دوستانہ طریق پر ناراضی کا اظہار فرما کر مضامین کی اشاعت موقوف کرادی۔ گو مجھے اس امداد کی ضرورت نہ تھی مگر جناب منشی عزیز احمد صاحب کی یہ ہمدردی باوجود عیسائی ہونے کے بہت کچھ شکر گذاری کی مستحق ہے +

بلاد اسلامیہ چھوڑنے سے پیشتر میں نے استنبول۔ بیروت۔ اور مصر میں تجارتی مال کی خرید وفروخت کے واسطے ایجنٹ مقرر کئے۔ اور جو مال ہندوستان

سے میرے نام روانہ ہو چکا تھا اس کے وصول کرنے کے مختار نامے باضابطہ برٹش کونسل کے روبرو تصدیق کرا دیئے۔ مگر بُعد مسافت۔ اور نیز یہاں کے مسلمانوں کے اصول تجارت سے ناواقفیت کے باعث بجز نقصان اور کچھ نتیجہ نہ نکلا +

تمت

عربی زبان سیکھنے کی کتابیں

حافظ عبدالرحمن صاحب امرتسری نے مصر و شام کی سیاحت کے بعد عربی بول چال کا ایک مفید سلسلہ لکھنا شروع کیا جس کے دو حصے ابتک شائع ہو چکے ہیں :-

حصہ اول میں ابتدائی سبقوں کے مفردات لکھ کر پھر ان سے کثیر الاستعمال جملے مرتب کیے ہیں اور ہر جملے کے مقابل اس کا بامحاورہ اردو ترجمہ لکھا ہے۔

بول چال کے علاوہ اسمیں دو خصوصیتیں اور ہیں۔

(۱) مصر و شام کے علماء و تاجروں کے خطوط

(۲) بارہ سو لفظوں کی فرہنگ مع ترجمہ اردو و انگریزی

طبع سوم۔ قیمت فی جلد ۸/

کتاب الصرف اس کتاب میں عربی صرف کے ضروری مسائل میزان الصرف سے لیکر شافیہ تک درج ہیں جملہ مضامین سبقوں میں منقسم اور ہر سبق کے ساتھ امثلہ مشقی و سوالات امتحانی تحریر ہیں۔ ....

طبع ششم قیمت فی جلد ۷/

حصہ دوم میں ضرب الامثال نوادر مترادفات اضداد۔ اسما مشتقہ۔ جملوں کی ترکیب عربی عبارات کے مطالب عربی کے ذریعے ادا کرنا مختلف عبارتوں کو بہ تغیر و تبدل لکھنے کا طریق معہ ترجمہ درج ہے اسکے علاوہ مضامین ذیل شامل ہیں

(۱) مصر و شام کے اخباروں کے انتخاب

(۲) ایک ہزار الفاظ جدیدہ کی فرہنگ مع ترجمہ اردو

سنہ ۱۹۰۴ء میں بار اول طبع ہوئی قیمت فی جلد ۸/

کتاب النحو اس کتاب میں عربی نحو کے ضروری مسائل نحو میر سے لیکر کافیہ تک درج ہیں سبقوں کی تقسیم اور امثلہ مشقی و سوالات امتحانی کا التزام کتاب الصرف کے مطابق ہے بتعدد سبقوں کے بعد کچھ غلط جملے بغرض تصحیح بھی دئے گئے ہیں

طبع چہارم قیمت فی جلد ۵/

یہ کتابیں منیجر حبشتین الحنفی لاہور کشمیری بازار سے مل سکتی ہیں